الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی سید الرسل وخاتم النبیین

سیاست کے قرآنی اقدار

تالیف

محمد طفیل کوہاٹی

مدیر ندوۃ التحقیق الاسلامی کوہاٹ

ناشر

ادارہ اشرفیہ عزیزیہ کوہاٹ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔سیاست کے قرآنی اقدار
مصنف۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد طفیل کوہاٹی
ناشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ادارہ اشرفیہ عزیزیہ کوہاٹ
طبع۔۔۔۔۔۔۔۔۔اول
تعداد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۰۰۰
سن طباعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۴۴۶ھ

ملنے کے پتے

۱۔ندوۃ التحقیق الاسلامی کوہاٹ۔03369018418
۲۔ادارہ اشرفیہ عزیزیہ پشاور۔03219006321
۳۔مکتبہ سیدنا امیر معاویہ پنڈی روڈ کوہاٹ۔03348251826

پیش گفتار

اس وقت عالم اسلام بدترین سیاسی بحرانوں کا شکار ہے، کئی خطوں پر عالمی ساہوکاروں کا قبضہ ہے جہاں سے اہل اسلام کے بہترین وسائل لوٹے جارہے ہیں، کہیں جابر قوتوں کے خلاف آزادی کی تحریکات برپا ہیں تو کہیں مسلمان باہم دست و گریباں ہیں۔ جن خطوں میں قدرے استحکام ہیں، وہاں بھی آئین و قانون اور نظم سیاسی کے حوالے سے دینی اقدار کی بجائے مروجہ سیاسی اصولوں اور نظم کی پیروی ایک عالمی مجبوری بن گئی ہے۔ جن خطوں میں طویل قربانیوں کے بعد استعماری طاقتیں زوال آشنا ہوئی ہیں وہاں بھی قربانیوں کا حقیقی ثمرہ حاصل کرنے، امت مسلمہ کو ایک حقیقی اسلامی نظم اجتماعی کا نمونہ فراہم کرنے اور جہاں بانی کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے ابھی گہری بصیرت اور طویل سفر درکار ہے۔ ایسے حالات میں مسلمان ممالک کے پاس کیا امکانات ہیں جنہیں بروئے کار لاکر وہ داخلی و خارجی سیاست میں استحکام و خود مختاری کا کٹھن راستہ طے کرسکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب تلاشنے کے لیے ناچیز عموماً قرآن مجید میں ذکر انبیاء کرام علیہم السلام کی حکومتوں، سیاسی و آزادی کی تحریکوں، معاشی اصلاحات، اغیار کے مقابلہ میں قوموں کی روحانی، سیاسی و نظریاتی تربیت اور ان کے مقابلہ میں طاغوتی قوتوں کے طریقہ کار پر غور کرتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے حتمی اور غیر مبدل اصول و قوانین پر عمل کے نتیجے میں انبیاء کرام کی جماعت نے جو غیر معمولی اور معجزانہ نتائج حاصل کیے وہ انسانیت کے پاس ان اصولوں کی تاثیر اور نبوی عزم وہمت کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ قرآن مجید کے ذکر کردہ یہ واقعات قصہ گوئی اور تاریخ دانی نہیں کیونکہ قرآن مجید قوموں کی داستانیں سنانے نہیں اترا، یہ عبرت و موعظت اور دستور حیات ہے، اس کا لفظ لفظ عمل کی تحریک ہے۔ عالم اسلام کے پاس آج کے بدترین سیاسی بحرانوں سے نکلنے کے لیے قرآن و سنت

کے ان عملی نمونوں میں واضح رہنمائی موجود ہے، قرآن مجید نے محض تعلیمات پیش نہیں کیں بلکہ ان تعلیمات کے نتیجے میں نتائج پیش کرنے والی قوموں کی عملی مثالیں ذکر کی ہیں، جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ سیاست کے ان قرآنی اقدار کو اگر منشور عمل بنالیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ نتائج مرتب نہ ہوں، جن کا مشاہدہ ماضی میں بارہا کیا جاچکا ہے۔

سیاسی نظاموں کے پرکھ کی واحد کسوٹی

سیاست کا عصری اور مروجہ نظام جو کہ انسانی دماغوں کا نتیجہ ہے، ایک دھوپ چھاؤں کی مانند ہے جو ایک حال پر قائم نہیں رہتا۔ تاریخ انسانی شاہد ہے کہ یہ نظام ہائے انسانی دم بدم بو قلموں رنگ بدلتے آئے ہیں، مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ اس کی وجہ ارشاد فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہر زمانہ کے خیالات یکساں نہیں ہوتے، حالات و ظروف بدلتے رہتے ہیں، خیر و شر اور حسن و قبح کے انسانی معیار میں تغیر آتا رہتا ہے، جو کل حق نظر آرہا تھا وہ آج باطل دکھائی دیتا ہے، اور جو آج غلط ہے وہ کل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ انسانی علم کی کوتاہی و نارسائی، مستقبل و مغیبات سے ناآشنائی، حصول جاہ و اقتدار اور مال و دولت کی حرص و آز سے مل کر ہر روز نئے نئے سیاسی نظریوں کو وجود بخشتی ہے۔ لیل و نہار کی ہر گردش کے ساتھ سیاسی افکار و خیالات، نظریات اور طرق کار میں تغیر و تبدل اور اتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے۔ اہل سیاست اپنے ''مزعومہ'' فکری و سیاسی نظاموں کی کامیابی اور طاقت و اقتدار کے حصول کے لئے ہر قسم کی جدوجہد میں مشغول رہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے ہر قسم کے اسباب و وسائل بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ غرض اس تماشہ گاہ عالم میں سیاست کی رنگا رنگی ہر روز ایک نیا منظر پیش کرتی ہے اور زمانہ کے ہر موڑ کے ساتھ ساتھ سیاست بھی اپنا رخ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے بالمقابل دین جو ''حق مطلق'' اور ''صداقت محض'' ہے، وہ دائمی و ابدی اور ناقابل تغیر ہے۔
>
> اس لئے اہل دین کے لئے ہر تغیر پذیر سیاسی نظریہ کے پرکھ کا معیار دین

کے غیر متغیر حقائق ہیں اور ہر سیاسی فکر و نظریہ اور اس کے طریق کار کے حسن و قبح کسوٹی دین کے غیر متبدل اصول ہے، ظاہر ہے کہ نہ ہر نظریہ فکر دین کے معیار پر کامل اتر سکتا ہے اور نہ ہر سیاسی نظام دین کہلایا جاسکتا ہے۔ نہ ہر غلبہ و تفوق کی کوشش کو "اسلامی سیاست" کہا جاسکتا ہے۔ اس بناپر اہل دین و سالکین صراط مستقیم کے لئے ہر قسم کی سیاسی تگ و دو، کوشش و جستجو میں شرکت واشتغال بغیر اس کی حقیقت ومآل کو جانے ممکن نہیں۔ "

(مقالات اشرف، ج:۱، ص:۲۰۹)

اسلامی سیاست کی بنیاد: دعوت

اسلام دین ہے اور دین کی جامعیت وہمہ گیریت کا تقاضا ہے کہ اس میں انسانیت کے نظم اجتماعی کے لیے ایسے ہی غیر مبدل وحتمی اصول و قوانین موجود ہوں، جیسا کہ انفرادی عبادت اور اصلاح احوال واخلاق کے لیے تفصیلات مہیا ہیں۔ اسلام صرف "فرد "کو ہی مخاطب نہیں بناتا بلکہ "سماج" اور "حکومت "کو بھی رہنمائی بخشتا ہے۔ یہاں عیسائیوں کی طرح قیصر وخدا کے اختیارات الگ الگ نہیں، بلکہ جو کچھ ہے وہ خدا کی حاکمیت اعلی کے تحت ہے۔ تاہم خالص اسلامی سیاست کے برگ وبار کے لیے اپنی زمین درکار ہوتی ہے ،اس کے پنپنے کے لیے پہلے افراد اور معاشرہ کی ضروری تربیت ناگزیر ہوتی ہے، اسلام کا وہی سیاسی انقلاب نتیجہ خیز ثابت ہوا ہے جو دعوت کی راہ سے تخم ریزی کرتے آیا ہو، ورنہ نرے انقلابات نے امت میں سوائے خونریزیوں اور فتنہ سامانیوں کے اور کچھ پید نہیں کیا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ارشاد ہے:

"اسلامی سیاست دعوت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ دعوت میں سیاست خود بخود آجاتی ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فائنینس (FINANCE) کے وزیر اور سیاسی قوتیں جمع نہیں کیں، نہ یہ کہا کہ آؤ! مل کر حکومت قائم کریں۔ صرف کلمہ کی طرف لوگوں کو بلایا، دین کی دعوت دی، سیاست ذیل میں خود بخود آگئی، گو اسلام میں سیاست ودعوت علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں، لیکن سیاست

کے منافع اور ضرر سے دعوت پر بھی اثر پڑتا ہے۔"

(معارف اعظم گڑھ، ص:۲۵۱ج:۴۰، نمبر:۴)

مسلمانوں نے قرآنی دعوت کے مطابق جب فرد وسماج کی تربیت کی تو اس سے ایک صالح سیاست خود وجود میں آئی، جس کے لیے اصول و قوانین ان کے ہاں موجود تھے اور اس کے پھلنے پھولنے کے لیے زمین بھی اپنی تھی، لیکن جہاں قرآن مجید کے ان سیاسی و دعوتی اقدار کو فراموش کیا گیا تو مسلمان سلطنتیں تو باقی رہیں لیکن خالص اسلامی سلطنتیں ناپید ہو گئیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

" یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے، مگر حقیقت ہے کہ اسلام کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھی، وہ گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد و چند عبادات تک محدود ہو کر رہ گئی، بنی اُمیّہ نے اپنے عمل سے سیاست کو دین سے خارج کر دیا اور عباسیہ نے تہذیب و تمدن و آداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر لیا۔ اس کے بعد ایرانی و ترکی و تاتاری سلاطین نے قرآن کے ساتھ آئین و شیروانی اور تورۂ چنگیزی کا اضافہ کیا۔ وہ دین تو حضرت محمد ﷺ کا رکھتے تھے۔ مگر ان کی سیاست اور خراج و باج کے آئین قیصر و کسریٰ اور چنگیز و ہلاکو کے دستور و قواعد پر مبنی تھے۔ اس لئے ہماری یہ پچھلی سلطنتیں مسلمانوں کی حکومتیں تو ضرور تھیں مگر اسلام کی نہ تھیں یعنی ان کے فرمانروا مسلمان تھے، مگر ان کی حکومت کا قانون اسلامی نہ تھا۔ جس طرح آج انگریزی عہد میں بھی " محمڈن لا" جاری ہونے سے کوئی حکومت اسلامی نہیں ہو سکتی تھی۔ تو کل صرف لفظ نکاح و طلاق و وقف وغیرہ کے اجراء سے سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی۔ اِلّا یہ کہ اس لفظ کے استعمال میں ہم ایک نوع کا مجاز و تساہل برتتے ہیں۔"

(معارف اعظم گڑھ، ص:۲۵۱ج:۴۰، نمبر:۴)

اسلامی سیاست کا بنیادی جوہر: صالح فرد و سماج

بغیر فرد و سماج کی تربیت کے سیاسی انقلابات باہمی چپقلشوں اور رنجشوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور قربانیوں کا ثمرہ ضائع ہو جاتا ہے۔ جب تک افراد کی نصب العینی نظر درست نہ ہو اور اس کی بھرپور اصلاح کو مقصد نہ بنایا جائے، دینی و سیاسی تحریکوں سے احیاء اسلام اور اعلاء کلمۃ اللہ کا کام ہر گز نہیں لیا جا سکتا۔ ان کے پاس اسلام کا ٹائٹل بھی ہو گا اور جہد و جہاد کی شکل بھی ہو گی لیکن حقیقی اسپرٹ اور روح سے محرومی کے نتیجے میں نصب العین محض شخصی ترقی اور مفادات ہوں گے اور اسی شخصی ترقی اور نمو کا نام ملی و اسلامی ترقی رکھ دیا جائے گا۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ مملکت خداداد پاکستان کی تحریک کے دوران ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

> ”جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ پیش نظر سیاسی انقلاب خواہ کتنا ہی خوش آئند ہو، ان کا اعلیٰ مطمح نظر نہیں بن سکتا، ان کا اصلی مقصدِ حیات اشخاص کا عروج و زوال، پارٹیوں کی شکست و ریخت، وزارتوں کا عزل و نصب اور زمینوں کا ردوبدل نہیں۔ بلکہ عقائد و اصول کی تصحیح، مقصد حیات کی تعیین اور مسائل زندگی میں اسلامی نظام کی سچی تقلید اور پیروی ہے اور اس کی برقراری کے لئے دلوں میں سچی تڑپ اور ناقابل سکون اضطراب کی ضرورت ہے۔ غرض ہم کو نئے سرے سے ایک نئی عمارت کا کام کرنا ہے۔ بحمد اللہ کہ مسلمان نوجوانوں میں اس حقیقت کا ادراک ہو رہا ہے اور یہ آواز پہلے کی طرح اب نامانوس نہیں رہی ہے (کہ) ”رجوع الی الاسلام“ یعنی زندگی کے ہر اصول میں اسلام کی طرف بازگشت ہی ہماری ہر بیماری کا علاج ہے۔ اس لئے حکومت کا خواب دیکھنے والوں کو پہلے اسلام کا خواب دیکھنا چاہئے کہ اسلام کیا ہے؟ اگر نہیں ہے، تو ہمارے اندر وہ انقلاب کیسے پیدا ہو جو ہم کو ترکستان کی راہ سے ہٹا کر حجاز کی طرف لے جائے، جو ہم کو یورپ کی نقالی کی بجائے خود اپنی اصلیت مفقودہ کی تصویر دکھا دے۔ تاکہ ہم خلافت موعودہ کے مستحق ٹھہریں۔ جب

تک ہمارا مقصد صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین نہ ہو گا اور اسی کے لئے روٹھنا اور منانا اور مرنا اور جینا نہ ہو گا۔ ہم اسی طرح ممبریوں اور وزارتوں اور لیڈریوں کے لئے آپس میں لڑتے، مرتے اور کٹتے رہیں گے۔ کیونکہ ہم نے اپنا مقصود انہی شخصی اعزازات اور اسی جاہ و منصب کے حصول کو بنا رکھا ہے اور اسی کا نام ہم نے اسلامی ترقی رکھ چھوڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ عقائد و عبادات کے ساتھ اسلامی سیاسیات، اسلامی اقتصادیات اسلامی طریق تجارت اسلامی اصول مضاربت (یعنی سرمایہ اور مزدوری کے طریق تعاون)، اسلامی طریق کاشتکاری، اسلامی طریق کارخانہ داری، کسانوں اور مزدوروں کے اسلامی حقوق، اسلامی لین دین اور معاملات کے مسائل اور دیگر تمام ضروری امور کے متعلق خالص اسلامی حل لوگوں کے سامنے رکھا جائے اور اس کے قبول و عمل کی دعوت دی جائے جس سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو اور مسلمان مسلمان بن کر دنیا میں ظاہر ہوں"۔ (معارف، ص:۲۴۴، ۲۴۳ نمبر:۴ ج:۵۷)

بغیر نظریاتی و اصلاحی تربیت کے سیاسی تحریکوں کے نتائج

سطحی و وقتی سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور جوش و خروش سے ٹھوس نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے، بلکہ ان بنیادوں پر کی جانے والی محنت قیمتی وسائل کے برباد ہونے اور قربانی کے نام پر اپنا سر پھوڑنے کے سوا کوئی نتائج مہیا نہیں کر سکتی۔ افراد کی نظریاتی تربیت، مقصد کے ساتھ وابستگی کا شعور اور صبر وضبط کے بغیر کوئی معرکہ سر نہیں ہو سکتا، آج ہم ساری دنیا پر اسلام کے غلبہ کے لیے بے چین ہیں لیکن خود پانچ فٹ کے جسد پر نفس و شیطان کے غلبہ کو توڑنے کے لیے تیار نہیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ سیاسی تحریکوں کو صحیح تعمیر کی دعوت دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

" جماعت کی تعمیر صرف جذبات، جوش و خروش اور ہنگاموں سے نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی مقصد کے ساتھ عشق کی سی وابستگی اور اس کے حصول کی راہ میں جان و مال و عزت ہر چیز کی قربانی کا حوصلہ ہونا چاہیے اور اس راہ میں موانع کی جو

شکلیں پیش آئیں،ان کے ازالہ اور برداشت میں صبر و ضبط اور عزیمت و استقلال اور حصول مقصد کے بعد اس حاصل شدہ مقصد کی بقا کے لئے اخلاق کی پابندی، عیش و آرام کی زندگی سے پرہیز،مال و دولت اور جاہ و عزت کی حرص و محبت سے آزادی، مختلف عناصر کے مختلف افراد کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اور عدل و انصاف کی بقا کو ہر ذاتی منفعت اور ہر شخصی فائدہ مندی سے برتر جاننا اور رکھنا اور اسی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنا، جب تک کسی جماعت کے افراد میں اکثریت اور اغلبیت کے ساتھ یہ اوصاف پیدا نہ ہوں گے۔ اول تو کوئی جماعتی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور ہو بھی جائے تو باقی نہیں رہ سکتا۔ اب ہم کو دیکھنا ہے کہ آیا ہماری اس وقت کی جماعتوں میں یہ اوصاف پیدا ہیں یا نہیں، اگر نہیں ہیں، تو پیدا کرنا چاہئیں اگر ہیں تو ان میں مزید ترقی اور پختگی کی فکر کرنی چاہیے اور ہمارے رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنی مختلف تحریکوں اور تعلیموں میں اُن اصولوں کا سبق دیا کریں۔ جماعتیں بھی بچوں ہی کی خاصیتیں رکھتی ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کے اصول بھی اُنہی جیسے ہیں۔ اسلام میں بدر کا معرکہ جو ۳۱۳ مسلمانوں کا کارنامہ ہے ہر وقت پیدا کیا جا سکتا تھا مگر معرکہ بدر کے وقوع کے لئے تیرہ برس کے انتظار کی ضرورت پیش آئی اور جب تک ٹھوک بجا کر اور آزمائشوں کی آگ میں تپا کر ان کو دیکھ نہیں لیا گیا،ان کو معرکوں میں نہیں لایا گیا اور اس سے اندازہ ہو گا کہ جماعتوں کی تعمیر صرف ضد اور ہٹ، سب و شتم، طعن و طنز، شور و غل اور مختلف نعروں کے شعر پڑھنے اور چیخنے سے نہیں ہوتی۔ بلکہ مقصد کی بلندی، مقصد سے عشق نما وابستگی، اس کے حصول و بقا کے لئے اعلیٰ اخلاق، پختہ سیرت اور مضبوط کیرکٹر پیدا کرنا ضروری ہے۔ تاریخ میں اس کی بکثرت مثالیں ہیں کہ جماعت نے اپنے وحشیانہ جوش اور شجاعت سے کسی چیز کو حاصل کر لیا۔ لیکن چونکہ اس کی بقا کے لئے جو اخلاق اور کیرکٹر چاہیے تھا وہ ان کے اندر موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ مقصد اُن کے

ہاتھوں سے بہت جلدی کھو گیا، ابھی تک ہندوستان کی تاریخ میں اودھ کی سلطنت، روہیلوں کی ریاست، سکھوں کی شاہی اور مرہٹوں کی پیشوائی میں عبرت کی داستانیں چھپیں ہیں۔''

(معارف، ص:۱۶۲، ۱۶۳، ج:۵۷، نمبر:۳)

۱۹۴۵ء کے تاریخی الیکشن پر مسلمانانِ ہند کو تلقین فرماتے ہیں:

آج کل مسلمانوں میں الیکشن کا بحران ہے۔ اس بحران میں جس طرح نامعقول طریقوں سے لوگ اپنی قوت کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ حد درجہ نامناسب ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سب و شتم، لعن و طعن، اور زدو کوب سے بھی پرہیز نہیں کیا جارہا ہے، یہ طریق عمل، استدلال کی قوت ظاہر کرنے کی بجائے اس کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ مذہب اور دین کی حمایت کا نام لے کر عوام کو جوش دلانا اور ان سے اپنا کام نکالنا انتہائی غلط رہنمائی ہے۔ جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ مسلمانوں کو ضبط، صبر، ڈسپلن، تنظیم، استقامت، تحمل، برداشت، ایثار باہمی ہمدردی، عملی وحدت اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی جائے، جو سیاست کی جنگ کے سب سے کارگر ہتھیار ہیں۔ صرف زبانی جوش و خروش، گرما گرم محفلی اور اخباری بحثیں اور براہ راست دست و گریباں ہونا قوم کی طاقت نہیں۔ ہماری بحثوں کا موضوع مسائل کا صواب و خطا ہونا چاہیے۔ نہ کے اشخاص کے محاسن و معائب کا اظہار۔''

(معارف، ص:۲۶۶، ج:۵۶، نمبر:۵)

ان اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ فرد و معاشرہ کی ناگزیر تربیت کے بغیر مؤثر سیاسی تحریک برپا کرنا ناممکن ہے، اس کے بغیر اعلاء کلمۃ اللہ کی چوٹی تو کیا سر ہو خود سیاسی جدوجہد جنگ و جدل، رقابتوں، دشمنیوں اور عداوتوں کی نذر ہو جاتی ہے اور امت کے بہترین دماغوں اور صلاحتیوں کا مصرف بجز ان جھگڑوں کو نمٹانے کے کچھ باقی نہیں رہتا۔ لیکن آج کل کے دور میں یہ بھی ممکن نہیں کہ سیاسی میدان کو مکمل ترک کر دیا جائے، لہذا ضروری ہے کہ فرد و معاشرہ کی اصلاح و تربیت کا کام اس طور پر ہو کہ

سیاسی نظم کے لیے اہل افراد تیار کیے جائیں، نیز امت میں موجود سیاسی جماعتوں کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور انہیں نبوی سیاست کے اس قرآنی منہاج کے مطابق ڈھالنے کی جدوجہد کی جائے، جس کے بغیر دینی سیاست کا وجود ہی ناممکن ہے۔

دینی سیاست کے نام پر اغیار کی نقالی اور اس کے تباہ کن اثرات

افسوس ناک امر یہ ہے کہ عالم اسلام کے بیشتر حصوں میں جو حکومتیں خالص مذہبی عنوان سے وجود میں آئیں، یا ان میں جو سیاسی جماعتیں مذہب کے نام پر سرگرم عمل ہیں، ان کے پاس "عنوان" تو اسلام کا موجود ہے، لیکن عملاً وہ فرنگی مآبی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، ان کے سیاست کے اطوار عزل وانتخاب سے لے کر قانون سازی تک اغیار کی پیروی کے نمونے ہیں۔ اس کا یہ افسوسناک اثر سامنے ہے کہ اب انہی فرنگیانہ اطوار واقدار کو "دینی" سمجھا جارہا ہے اور اس پر نظر ثانی کی دعوت بھی ایک طرح جرم سمجھا جانے لگا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ اس کورانہ تقلید وجمود کا پردہ چاک کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "فقر وتصوف، علم وفن اور تمدن وسیاست غرض زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمان اپنی غرض وغایت اور اصول ومبادی کو چھوڑ کر ہندی وعجمی ویونانی و فرانگی تصور حیات کی تقلید میں مصروف ہوگئے اور اب تک مصروف ہیں۔ اور اس کی رونق کو اپنے کاشانہ کی عظمت جانتے ہیں۔ فقر وتصوف میں ہندی ویونانی تصورات جوگ واستشراق کی تقلید ہے۔ علم وفن میں عجمی ویونانی مذاق کی پیروی ہے۔ تمدن وسیاست میں ایرانی ورومی رنگ کی آمیزش ہے۔ کیا عجیب بات ہے کہ وہ دین جو قیصریت وکسروانیت کے رنگ کو مٹانے آیا تھا۔ اسی کے نام لیوا چالیس برس کے بعد خود ہی قیصر وکسروانیت کے رنگ میں آہستہ آہستہ ایسے رنگ گئے کہ اس کے امراء وحکام خلفائے راشدین کی جگہ قیصر وکسریٰ کی جانشینی پر فخر کرنے لگے۔ وہی تعیش، وہی سونے چاندی اور ریشم وحریر اور طاؤس ورباب کی زندگی مسلمان امراء وحکام کی زندگی کا مقصد بن گیا، بیت المال اس کا

ذاتی خزانہ بن گیا، اور سلطنت ان کی موروثی ملکیت، جاگیر داری و زمین داری، اسلامی اصول کی بجائے قیصر و کسریٰ کے طرز کی پیروی جاری ہو گئی۔ یہ تو عہد گزشتہ کا حال تھا۔ عہد حاضر میں یورپ کے تمدن اور سیاست کی نقالی ہماری اسلامی سلطنتوں کی فخر ہے، ہمارے دار السلطنتوں کے سامنے پیرس کے خاکے ہیں، ہماری خواتین کے سامنے انگلستان و فرانس کی عریانی اور رنگینی و بے حجابی ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی نگاہوں میں رقص و سرود اور ظاہری پوشاک و وضع کی اور طرز ماند و بود میں فرنگی مآبی، زندگی کی کامیابی کا سب سے اعلیٰ تخیل ہے۔ غرض مسلمانوں کے دل و دماغ اور ذہن و تصور سے زندگی کی وہ غایت اور حیات کا وہ مقصد جو اسلام نے پیش کیا تھا، یکسر مخفی اور پوشیدہ ہے۔

علم و فن پر غور کیجئے، تو ہماری قدیم تعلیم اب تک یونان کی تقویم پارینہ کی پرستش میں، اور تعلیم جدید یورپین ضلالت و گمراہی خیال کی عکاسی میں مصروف ہے اور سوائے تقلید و نقالی کے کوئی مجتہدانہ تصور ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہمارے سامنے جب اعلیٰ تمدن اور اعلیٰ سلطنت داری کا خیال آتا ہے۔ تو یورپ کی ایک سلطنت اپنی پوری ہو شربائی اور باطل آرائی کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے اور یہ حقیقت ہمارے سامنے سے گم ہو جاتی ہے کہ اسلام کا تصور سیاست اور تصور تمدن اور تصور علم و فن اپنا خاص ہے اور اسی کو دوبارہ پیدا کرنا اور دنیا کے سامنے لانا ہمارا قومی و ملی غرض و غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دیں کہ وہ (اس آئینہ میں اپنے خط و خال کو دیکھ کر) اپنی شکل کو پہچانیں اور غلط و گمراہ دنیا کے پیرو اور مقلد بننے کے بجائے دنیا کے امام و پیشوا بنیں اور ایک نئے تمدن، نئے طرز حیات، نئے مقصد زندگی اور نئے آئین سلطنت کی بنیاد ڈالیں اور اس وقت کی غمزدہ اور مصیبت سے بھری ہوئی امن کی جویا اور سکینت کی پیاسی دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دیں اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی تکمیل کریں جو دنیا و آخرت کی صلاح و فلاح کی کفیل ہو اور سیاست اور ملک داری کو

حرص وہوا، جھوٹ اور دغا اور مکر وفریب سے آزاد کریں۔

اسلام نے ببانگ دہل بتایا ہے اور تاریخ نے اس کی تائید کی ہے کہ حکمرانی کے استحقاق کے لئے اخلاقی جوہر لازمی ہے۔ حب مال اور حب جاہ یہ دو لبالب زہر کے پیالے ہیں۔ جو شربت زلال کی شکل میں حکام اور لیڈروں کو پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کی طمع میں آکر ان کو پی لیا۔ تو نہ صرف ان کی بلکہ پوری ملت کی موت کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لئے وہ حکومت صالحہ جس کی دعوت اسلام کا آئین دیتا ہے وہ ایثار واخلاص اور خدمت خلق کے للہی جذبات سے تعمیر پاتی ہے۔ لیکن ان جذبات کی آفرینش اور مال وجاہ کی محبت سے قلوب کی حفاظت اس تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں جو قرآن سے ہدایت یابی کی پہلی شرط ہے۔ "ھدی للمتقین" بے انصافی، کینہ پروری، رشوت خوری، پرمٹ فروشی، بلیک مارکیٹنگ جن کی بدولت ہندوستان وپاکستان کی بنیادیں ہل رہی ہیں، وہ حاکموں عہدہ داروں اور وزیروں اور سوداگروں اور تاجروں اور زنداروں اور کسانوں کی انھیں اوصاف عالیہ سے خالی اور محروم ہونے کے سبب سے ہیں اور اس کا اصل سرچشمہ اس خشیت الٰہی اور جزائے "یوم الدین" سے بیگانگی ہے۔ جس سے قلوب تزکیہ وتصفیہ کے آب صافی سے پاک سے پاک وصاف ہوتے ہیں۔ اجتماعی کاموں کو چھوڑ کر انفرادی کام بھی تزکیہ قلب اور تصفیۂ اخلاق کے بغیر فوز حقیقی سے محروم رہتے ہیں۔ افراد کے قلوب جب تک عناد وحسد، بغض و کینہ، عجب وغرور، ریاو نمائش سے خالی اور اخلاص وایثار، توکل واعتماد الی اللہ اور صبر وثبات سے معمور نہیں ہوتے۔ دنیا میں کامیابی سے اور آخرت میں اجر وثواب سے ہم کنار نہیں ہوتے اور یہ ایسے اصول ہیں جو ایک طرف اصول و تعلیمات دین اور دوسری طرف اجتماعی وانفرادی مبادئ نفسیات سے ثابت اور مؤید ہے۔ شخصی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، اس کے کاموں کی غایت رضائے الٰہی کی طلب، اور احکام الٰہی کی تعمیل اور اعلاء کلمۃ اللہ کے بلند تخیل کے سوا اور کچھ

ہو ہی نہیں سکتی۔ غیر فانی ملت کا مقصد حیات ایسے ہی غیر قانونی مقاصد ہو سکتے ہیں۔ ورنہ محض دنیاوی فوز و فلاح یعنی دولت و حشمت، عیش زندگی اور اسبابِ راحت کی فراوانی اور بلند محلات اور خدم و حشم کی کثرت تو وہ پست و متبذل مقاصد ہیں جو زندگی کا فریب اور حیات انسانی کا سراب ہیں۔ ''ذلک بأن اللہ ھو الحق وانّ مایدعو من دونہ الباطل، کل شئ خلا اللہ باطل''

(مقالات اشرف، ج:۱، ص:۲۲۱)

ایک دوسرے مقام پر سورۃ فاتحہ کی تفسیر کرتے ہوئے مسلمانوں اور ممالک اسلامیہ کے اپنے خاص مقاصدِ حیات و طریقہ زندگی سے گریز اور سید الانبیاء ﷺ کے اسوۂ کاملہ سے افسوسناک اعراض کا بیان اور ان کا یورپین یہود و نصاریٰ کے مردود و گمراہانہ طریقوں کی پیروی کا تذکرہ کس حکیمانہ، پر درد و موثر علمی انداز میں فرماتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

'' یورپ کا ہر فتنہ اور ذہنی انقلاب کا ہر ہنگامہ، جو دنیائے نصاریٰ میں رونما ہوتا ہے، اس کی تہہ میں جو قوت کار فرما ہوتی ہے، وہ یہودی ہوتی ہے۔ وطنیت کا فتنہ، بین الاقوامیت کا فتنہ، ڈیموکریسی کا فتنہ، سوشلزم کا فتنہ، بالشوازم کا فتنہ، ان میں سے کون سی چیز ہے، جو یہود کی دماغی سرکشی اور ذہنی طغیانی خیال کی ممنون نہیں، آج یورپ اور امریکہ میں ایک طرف سرمایہ پرستی اور جمہوریت کا پہرا قائم ہے اور دوسری طرف مزدوروں اور کسانوں کی دعوت کی غلط صورت اور سوشیالسٹ تحریک کی لادینی حکومت کے کیمپ لگے ہوئے ہیں اور دونوں چیزیں یہودیوں کی طاغیانہ رہنمائی اور نصاریٰ کی گمراہی کے دو گونہ عناصر سے مرکب ہیں اور ساری دنیا ان دونوں کی طغیانی و گمراہی کے فتنوں میں سر سے پاؤں تک مبتلا ہے۔

آج ہمارے اسلامی ممالک خواہ وہ اپنے کو آزاد کہیں یا غلام، حاکم کہیں یا محکوم، کیا انہیں دو فتنوں میں سے کسی ایک میں مبتلا نہیں۔ اب یاد کیجئے ''رب العالمین، مالک یوم الدین'' نے اول روز سے ہم کو یہ بتایا تھا کہ تم ہمیشہ، ہر حال

میں اور اپنی ہر چال میں انبیاء کے راستہ پر قائم رہنا اور مغضوب اور ضال قوموں سے بچے رہنا، مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے اس کا الٹا کیا، یعنی انبیاء کے راستے کو چھوڑ کر مغضوب اور ضال قوموں کی راہوں کو اختیار کیا اور آج بھی یہی حال ہے، آج مسلمانوں کی ہر جماعت خواہ کسی ملک میں ہو اپنی ترقی و اصلاح اور سعادت کے لئے انبیاء کی طرف نہیں، بلکہ انہیں مغضوب اور ضال قوموں کی امامت کی اقتدا کے لیے بے قرار ہے۔ وضع قطع، تراش و خراش، صورت و سیرت، تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات، رفتار و گفتار، تجارت و اقتصاد و معاملات اور حکومت و سلطنت غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا رخ انبیاء کی طرف ہے؟ یا مغضوب و ضال قوموں کی طرف ہے؟ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ میرا منہ طرف کعبے شریف کے، مگر رفتار کی سمت لندن، پیرس، ماسکو، برلن اور نیویارک کی طرف ہے۔ زبان سے تو اپنی سعادت و ہدایت کو انبیاء اور خصوصاً سرور کائنات ﷺ کی پیروی میں منحصر مانتے ہیں۔ مگر دل میں اپنی ترقی کا راز یورپ و امریکہ کی پیروی میں منحصر مانتے ہیں۔ ہم میں سے بعضوں نے جو دانش مندی کے مدعی ہیں، دین اور دنیا کے دو حصے کر رکھے ہیں اور دین میں انبیاء کی اور دنیا میں ان مغضوبوں اور گمراہوں کی پیروی کے داعی ہیں، لیکن دین و دنیا کی یہ تقسیم کی تاویل بھی انہیں گمراہوں کی تعلیم کا اعادہ ہے جنہوں نے اپنے آسمانی صحیفوں میں یہ لکھا پایا ہے۔ کہ " جو قیصر کا ہے قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے خدا کو دو " گویا وہ دو خداؤں کے قائل ہیں، قیصر جو دنیا پر حکومت کرتا ہے اور خدا جو آسمان پر فرمانروا ہے۔ لیکن انبیاء کی تعلیم میں وہ (خدا) واحد ہے۔ وہ قیصر کون ہے جو خدا کے ساتھ برابر کی حکومت کا دعوے دار ہیں: "للہ ملک السمٰوٰت والارض" (آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے)" ان مغضوب و ضال قوموں کی ایجاد و اختراع، دولت و طاقت، حکومت و سلطنت کی ظاہری چمک دمک نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ ان کی

عریانی و بے پردگی، ان کی نفس پرستی و ہوسناکی و خود پسندی، ان کے تکبر و استکباران کے کفر و عصیان کی ہر تصویر ہمارے دل کو پسند ہے۔ ہمارے بچے، جوان، بوڑھے، عورت اور مرد ہر ایک اس کوشش میں ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کے اس مشترکہ پیدا کردہ تہذیب و تمدن، طور و طریق، شکل و لباس، تعلیم و تربیت کی راہوں کی اقدار کی تیز سے تیز دوڑ میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اور اس ناصح کی تکذیب میں مصروف ہے جو ان کو مغضوبوں اور گمراہوں کی پیروی سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ آج مسلمان نوجوان اپنی زندگی کے ہر پہلو میں اپنے رہنمائے اقدس ﷺ کا نمونہ نہیں، بلکہ لنینؔ، سٹالنؔ، ہٹلرؔ، مسولینیؔ، چرچلؔ اور روز ویلیٹ کے نمونوں کی تلاش اور ان کے روپ میں ہر طرح کوشاں ہیں اور انہی کی پیروی میں مسلمانوں کی نجات سمجھتے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اہل سیاست کو موجودہ مغضوب و دجال قوموں کے مذموم تمدن و تہذیب اور بے آئین نظام سلطنت و حکومت، ظالمانہ طریق حکمرانی و فرمانروائی، گمراہانہ طریق تعلیم و تربیت، فاسد اخلاق و کردار اور قزاقانہ اقتصاد و وحشیانہ طاقت اور مجرمانہ سیاست پر افسوس نہیں، بلکہ اس پر حسرت ہے کہ اس مجرم گنہگار، عریاں خوشنما، فاسد الاخلاق، قزاق اور وحشی طاقت کے حکمران و فرمان روا اور ظالم نظام اقتصاد اور فاسد اصول قضاوعدالت کے مالک ہم کیوں نہ ہوئے، ان کو یہ افسوس نہیں کہ شیطان کا یہ تخت جبروت کیوں بچھا ہے۔ بلکہ یہ افسوس ہے کہ ہم اس پر کیوں نہیں بیٹھے۔ ان کو شیطان کے تخت الٹنے کی فکر نہیں بلکہ اس پر جلوس فرمانے کی فکر مستولی ہے۔

مسلمان مدت سے اس حال میں ہیں کہ وہ اپنے کو بھول گئے ہیں اور دوسری قوموں کی نقالی میں مصروف ہیں۔ اسلام ایک مستقل نظام حیات، نظام اقتصاد، نظام سیاست اور نظام اخلاق کا نام ہے۔ خود اپنے نظامات سے روگرداں

ہو کر یا ان میں ترمیم و تبدیلی کر کے دنیا کے دوسرے ناقص و فاسد نظامات کو اختیار کرنے میں اپنی زندگی کی نجات جانتے ہیں۔

ترکی، مصر، شام، عراق، افغانستان، شمالی افریقہ، ہندوستان غرض وہ جہاں کہیں بھی ہیں، خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم، یورپ کی نقالی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا میں قیصریت اور کسروانیت کے علمبردار اور پیغمبروں کی بجائے ہلاکوئں اور چنگیزوں کے جانشین بن گئے۔ آج انقلاب کا عہد ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ پھر سے اپنی رفتار، سمت اور زندگی کے مقصد کو درست کریں، وہ اللہ کے محکوم، اس کے شریعت کے حامل اور دنیا میں اس کی شہنشاہی کے نمائندہ بنیں۔ ان کو پہلے اللہ کے قانون کو اپنے اوپر اور پھر اس کے بعد دوسروں کے اوپر نافذ کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کو ان معنوں میں قوم نہیں کہنا چاہیے جن معنوں میں رنگ اور نسل و نسب اور وطن کے اجزائے ترکیبی سے دنیا میں قومیں بنائی جاتی ہیں، بلکہ انسانی جماعتوں کا وہ ایسا مجموعہ ہے جن کے ترکیبی اجزا خاص خیالات، خاص عقائد، خاص اعمال، خاص اخلاق، خاص تمدن، خاص اصول سلطنت و حکمرانی ہیں۔ اس لئے وہ دوسری قوموں کے ساتھ متحد و محکوم ہو کر نہیں بلکہ مصالحانہ اور معاہدانہ اصول پر دوست بن کر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ورنہ ان کا وجود دوسری قوموں کے ساتھ مخلوط ہو کر پائیدار نہ ہو گا۔ اس لئے مسلمانوں کو ضرورت ہے ذہنیت کے بدلنے، خیالات کے پلٹنے اور صحیح فکر کو سامنے رکھنے اور صحیح نصب العین کو اپنے دل میں جگہ دینے کی، تاکہ دنیا میں وہ انبیاء کے نمائندے اور اسلام کا نمونہ بن کر ظاہر ہوں"۔ (معارف، نمبر:۵۔ ج:۵۹، ص: ۱۰۴تا۱۰۹)

وطن خداداد پاکستان کو "لا الہ الا اللہ" اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا اور جس کے حصول کے لیے طویل جدوجہد و عظیم قربانیاں پیش کی گئیں، اپنے وجود و تشکیل کے روز اول سے اس

بات کا متقاضی تھا کہ اس کی سیاسی اساس نبوی سیاست کے ان قرآنی اقدار پر قائم ہو جو ہمارے ترقی و استحکام کے ضامن ہیں، لیکن افسوس کہ بانیان پاکستان کی خواہش وسعی کے باوجود یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہ ہوئی اور مملکت خداداد رفتہ رفتہ سیاسی بحرانوں کی لپیٹ میں جاتا رہا۔ وطنیت، قومیت، لسانیت، فرقہ واریت، خانہ جنگی، عریانی، فحاشی، عیاشی، بدیانتی، لوٹ کھسوٹ، بدامنی وخون ریزی وہ کون سا طوفان ہے جو اس ملک اور اس کے باسیوں نے نہ سہا؟!!اس وقت ضرورت ہے کہ ہماری سیاسی دانش بحیثیت ایک مؤمن مسلمان مملکت خداداد کی تشکیلی بنیادوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے رجوع الی القرآن پر آمادہ ہو اور ''نبوی سیاست'' کے احیاء کا عزم کر لے، ظاہر ہے یہ کام ہمہ جہت ہے، اس میں تعلیم، ادب، فنون لطیفہ، معاش واقتصاد، عدالت وقضا اور سماج ومعاشرت کے ہر ادارے کی فکری ونظریاتی تجدید نو کی ضرورت ہو گی اور یہ کام فوری نہیں تدریجی ہو گا، تاہم اس کے لیے آمادگی اور عملی اقدام کی ابتدائی کوشش ہی نئی نسل کے لیے ایک رخ فراہم کر دے گی۔ یاد رکھیں! ہم صحیح معنوں میں ایک اسلامی مملکت کی تشکیل جو کسی قومی ووطنی نظریہ کی بجائے لا الہ الا اللہ کے امت پنا کی بنیاد پر قائم ہو اور جو حقیقی معنوی میں ہر حوالے سے خود مختار ہو تب کر سکیں گے جب ہم'' نبوی سیاست'' کی طرف عود کریں گے، خاکم بدہن اس کے بجز ہمارے پاس ان بحرانوں سے نکلنے کی کوئی قابل عمل راہ نہیں۔ ہم نے جن انسانی نظاموں کے ذریعے حالات سنوارنے کے تجربے کر لیے ان کی ناکامی ہمارا منہ چڑا رہی ہے اور یہ امت مزید شاید اس کی متحمل نہیں کہ اس پر مزید ایسے تجربات کیے جائیں جو انہیں تباہیوں کے سوا کچھ نہ دے سکیں۔

ذیل میں مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ کا ایک مختصر مقالہ نقل کرنا مفید سمجھتا ہوں، جو پاکستان اکادمی برائے دیہی ترقی پشاور کے علماء پراجیکٹ کے منعقد کردہ علماء کنونشن میں ۲۹/ فروری ۱۹۷۲ء کو پڑھا گیا تھا۔ یہ مقالہ مملکت خداداد کے تعمیر نو کے لیے ایک دستور کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرتؒ لکھتے ہیں:

> ''پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے۔ جس کی بنیاد اسلام کی اس جامع اور عالمگیر نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ دین اسلام ہی انسانوں کے دینی و دنیاوی تمام مسائل کے حل اور ضرورتوں کا کفیل ہے۔ بانیانِ پاکستان قائد اعظم مرحوم، لیا

قت علی خان مرحوم، اور دیگر زعماء لیگ پاکستان کی جدوجہد میں اسی نظریہ کو لے کر آگے بڑھے تھے، اور اسی کی بنیاد پر اسلامیان ہندوپاک نے اپنی امنگیں اور امیدیں اس خطۂ زمین کے ساتھ وابستہ کر دی تھیں، جس کا نام پاکستان تھا اور جس میں بقول شہید ملت علی خان مرحوم اسلامی نظریہ حیات کو عملی طور پر رائج کرنا اور اسے اسلامی نظام حیات کی تجربہ گاہ بنانا مقصود تھا۔ قائد اعظم نے اپنے کئی بیانون میں اس بات کو واضح فرما دیا تھا کہ قرآن ہی مسلمانوں کا واحد ضابطہ حیات ہے۔ جس میں اس کی آئینی، قانونی، مجلسی، معاشی، معاشرتی غرض زندگی کے ہر پہلو کا کامیاب حل موجود ہے۔ یاد دہانی کے طور پر چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:

قائد اعظم نے نومبر ۱۹۳۹ء کو عید الفطر کے موقع پر بمبئی سے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''مسلمانوں ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ قرآن پاک کو غور سے پڑھیں اور قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کر سکتی۔''

گاندھی کو اگست ۱۹۴۴ء میں لکھتے ہیں: ''قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے، اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی غرض یہ کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ امور حیات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق و فرائض تک، اخلاق سے لے کر انسداد جرائم تک، زندگی میں جزا اور سزا سے لے کر عقبی کی جزا و سزا تک ہر ایک فعل و قول اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے، لہٰذا جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہے تو حیات و مابعد حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں۔''

۱۹۴۴ء میں علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران فرمایا: ”رہنمائی کے لئے ہمارے پاس اسلام کی عظیم الشان شریعت موجود ہے۔ اسلام ہر شخص سے امید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض بجالائے۔“

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر ۱۹۴۳ء کی صدارتی تقریر میں واضح الفاظ میں اعلان فرمایا: ”مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرز حکومت کیا ہو گا۔ پاکستان کا طرز حکومت تعین کرنے والا میں کون! یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے اور میرے خیال میں مسلمانوں کے طرز حکومت کا آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا ہے۔“

تقسیم سے پیشتر شہید ملت لیاقت علی خان مرحوم نے جلسہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ”ہمارے سامنے ایک نہایت اہم سوال درپیش ہے اور وہ یہ کہ تم کس نظام کے تحت زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنی آئندہ زندگی اسلامی طور وطریق اور آئین و قوانین کے بموجب بسر کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہم کو ایک آزاد اور خود مختار ملک کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نظام زندگی کیا ہے، اور کن اصولوں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جائے گی؟ اس سوال کا جواب مسلمان کے پاس سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ مسلمان کے پیش نظر اس مقصد حیات کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے جو حضرت محمد ﷺ نے آج سے تیرہ سو برس قبل دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ حضرت محمد ﷺ جو پیغام الٰہی لے کر تشریف لائے تھے اب وہ ہمارے پاس ہے، اور وہ دنیا کی عظیم المرتبت کتاب قرآن شریف میں اب بھی بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے موجود ہے۔ ہر مسلمان کا دین وایمان ہے کہ اس کی موت وحیات سب ہی اللہ کے لئے وقف ہے۔ اللہ ہی ہمارا بادشاہ ہے اور وہ ہی ہمارا حکمران ہے۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جو کوئی بھی

حکومت کرتا ہے۔ وہ اللہ ہی کی طرف سے حکومت کرتا ہے کیونکہ تمام حاکمیت اور طاقت اللہ ہی کو زیبا ہے۔ اسلامی نظام زندگی انسان کا ساختہ و پرداختہ نہیں ہے۔ بلکہ واقعی طور پر وہ اس دنیا میں عمل پذیر رہ چکا ہے اور اب بھی ہمارے پاس موجود ہے۔"

ان زعماء ملت کے یہ واضح اعلانات حقیقتاً اس سچائی پر مبنی تھے کہ امت محمدیہ ﷺ مرحومہ کا اپنا ایک خاص مزاج ہے اور یہ لافانی اور بے مثال امت ہے۔ اپنے قوام و تشکیل ملی میں صرف اس اندرونی یقین و اعتقاد و جذبۂ وحدت کی محتاج ہے جسے "ایمان" کہتے ہیں۔ امت محمدیہ ﷺ کا مزاج سراسر دین پر قائم ہے۔ اگر اس کے دینی مزاج کی رعایت نہیں کی جائے گی تو یہ ملت من حیث الامت ختم ہو جائے گی۔ دوسری قومیں رنگ و نسل، وطن و زبان کی بنیادوں پر تشکیل پاتی ہے لیکن اسلام ان میں سے کسی بنیاد کو اصل قرار نہیں دیتا۔ وہ ان سب کی تخریب کے بعد اس مابعد الطبیعاتی جذبۂ ملی پر "امت" کی تشکیل کرتا ہے جسے دین کہتے ہیں۔ اسلام وہ قوی رشتہ ہے جو مختلف قوموں، رنگوں، اور نسلوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ صہیبؔ رومی ہوں یا بلال حبشیؔ۔ سلمانؔ فارسی ہوں یا ابو بکرؔ قریشی سب ایک ہی ملت واحدہ کے محترم افراد ہیں۔ ان کی "اسلامیت" نے رنگ و نسل کے تمام بندھنوں کو توڑ دیا۔ اسلام مسلمانوں میں عشق الٰہی و محبت رسول ﷺ کا والہانہ جذبہ پیدا کر کے اس داعیۂ اشتراک کو جنم دیتا ہے جو عقائد و مقاصد کی یکجہتی ہیں۔ مختلف ملکوں اور مختلف نسلوں اور مختلف رنگوں اور مختلف طبقات کے انسانوں کو اکٹھا کر دیتا ہے۔ یہ رشتہ روحانی، نسلی رشتہ سے برتر و قوی تر ہے۔ چنانچہ مفسرین امامؔ رازیؒ و امامؔ بغویؒ وغیرہ نے شواہد سے اس حقیقت کو واضح و مبرہن کیا ہے۔

بقول جامیؔ:

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

ترجمہ: اے جامی! بندہ عشق بن جا (یعنی احکام الٰہی کی بے چوں وچرا تعمیل کر) اور نسب وحسب (پر فخر ومباہات) چھوڑ دے کہ اس (دین کی) راہ میں فلاں بن فلاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اسلامی جذبہ ملی کے ایک سرشار سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے "اسلامی قومیت" کی بنیاد کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

ابی الاسلام لا اب سواہ

اذا افتخروا بقیس و تمیم

"میرے باپ کا نام اسلام ہے، اسلام کے سوا میرا کوئی باپ نہیں۔ لوگ قیس و تمیم کے قبیلوں پر فخر کرتے ہیں (اور میں مسلم ہونے پر فخر کرتا ہوں)۔"

اسلام ملت مسلمہ کا اجتماعی نفس ناطقہ ہے، اگر اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ ملت کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے ہوگا، تو یہ امت پھلتی پھولتی رہے گی اور جس قدر یہ جذبہ کم ہوتا چلا جائے گا اس پر اضمحلال وزوال کے آثار طاری ہوتے جائیں گے۔ حکیم شاعر اکبر الٰہ آبادی نے خوب کہا ہے:

جب سر میں ہوائے اطاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا

جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

غرض امت محمدیہ ﷺ اپنے قوام ومزاج میں جملہ امم وملل انسانیہ سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ دین ومذہب کے بغیر اس کا ملی تشخص قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد مذہب یعنی اسلام کی اہمیت پاکستان کی تعمیر نو میں ظاہر وباہر ہو جاتی ہے۔ ہر وہ نظام زندگی یا طریقہ کار جو اسلامی نظریہ حیات کے مطابق نہیں ہوگا۔ پاکستانی ملت کو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکے گا۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہے:

(۱) پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اس کا وجود اسلامی نظریہ حیات کا مرہون منت ہے، جسے تحریک پاکستان کا ہر واقف کار جانتا ہے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کوئی نظریاتی مملکت اپنے بنیادی نظریہ کو نظر انداز کر کے اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی۔ جیسے کوئی سوشلسٹ مملکت سوشلزم کے نظریہ کو پس پشت ڈال کر اپنی نظریاتی حقیقت کو گم کر دیتی ہے۔ اس طرح مملکتِ پاکستان اگر اپنے آپ کو اسلامی نظریہ حیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر پاتی۔ تو وہ نہ صرف اپنی نظریاتی وجود کو کھو دے گی بلکہ اس کا اپنا وجود و تشخص اور ''نام'' بھی (خاکم بدہن) مٹ کر رہ جائے گا۔ وہ ممالک اور قومیں جو وطنیت، رنگ اور نسل پر قائم ہیں وہ اگر کسی نظریہ کو قبول یا ترک کر دے تو ان کی وطنی، لونی اور نسلی انفرادیت باقی رہ سکتی ہے۔ لیکن اگر پاکستان اسلامی نظریہ حیات سے دست کش ہو جائے تو اس کے ہاتھ سے وہ رشتہ ہی نکل جائے گا۔ جس نے باشندگانِ پاکستان کو 'پاکستانی' بنایا ہے اور بنگالی، بلوچی، پٹھان، سندھی، پنجابی اور مہاجر کو ایک امت کا فرد بنایا ہے۔ غرض پاکستانی قومیت و وطنیت بلکہ اس کا نام تک اسلامی نظریہ حیات ہے، باقی و قائم ہے۔ اس لئے پاکستان کی تعمیر نو کا تصور بھی مذہب کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ ہر وہ قدم جو پاکستان میں اسلام کے خلاف اٹھے گا، ملک کو مشکلات سے دوچار کر دے گا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر قوم کا خاص مزاج ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد وہ بنیادی عقائد و نظریات اور رسوم و رواج ہوتے ہیں، جس میں وہ قوم دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے۔ امت محمدیہ اپنے مزاج کے لحاظ سے بہر حال '' مذہبی'' واقع ہوئی ہے، جو اسلام کے خلاف کسی چیز کو گوارا نہیں کر سکتی اور اس کا اجتماعی مزاج کسی ایسی چیز کو ہضم نہیں کر سکتا جو اسلام کے مخالف ہو۔

ملت پاکستانیہ کا ملی شعور دائمی طور پر کبھی ایسی بات کو قبول نہیں کر سکتا جو مذہب کے خلاف ہو۔ اس وجہ سے قوم کے مذہبی مزاج کو نظر انداز کر کے کوئی

قدم ملت کو تعمیر کی راہ پر نہیں ڈال سکتا۔ ان دو اہم بنیادوں کے بیان کے بعد چند حقائق کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

حضرات ! اسلام نرا نظریہ نہیں، بلکہ بقول قائد اعظم "ایک مکمل اور عملی ضابطہ حیات ہے"۔ دوسرے مذاہب عملی زندگی میں آکر شکست کھا سکتے ہیں، لیکن اسلام کا آئین و قانون، نظام حیات و دستور مملکت چودہ سو سال تک عملی کسوٹی پر کسا جا چکا ہے۔ اس میں ہر زمانہ کے چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے، اسلام کا خدائی و عادلانہ نظام دکھی انسانیت کے لئے واحد پیام نجات ہے۔ پاکستان کے مسائل کا حل بھی صرف اسلام ہے، جس کے بغیر ہمارا ہر مسئلہ مزید الجھتا جائے گا۔ آج پاکستان کی "وحدت کا راز "مختلف لسانی و علا قائی وحدتوں کو ایک "ملت" کی حیثیت سے مضبوط کرنے میں ہے۔ یہ بات واشگاف لفظوں میں کہی جا سکتی ہے کہ تعمیر نو میں اگر اسلام کے "جذبہ ملی" کو زندہ و باقی رکھنے کی کوشش نہ کی گئی اور "مذہبی وحدت و حمیت" کی آبیاری نہ کی گئی تو خدا نخواستہ اس پھول کی مختلف پتیاں بکھر کر رہ جائیں گی جس کا سب سے بڑا ثبوت مشرقی پاکستان کا دردناک سانحہ ہے اگر ہم نے اپنے دینی مزاج اور مذہبی یکجہتی کو پروان چڑھایا ہوتا تو آج یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ پاکستان کے مختلف خطوں اور لسانی وثقافتی وحدتوں کے جوڑنے کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس نمایاں حقیقت کے بعد تعمیر نو میں مذہب کی اہمیت بلکہ سبقت و فوقیت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں معاشی ناہمواریوں سے معاشرہ میں زلزلہ آیا ہے اور معاشی بے چینی اور طبقاتی منافرت کا ایسا طوفان برپا ہے جس سے ملک کی چولیں تک ہل گئی ہیں۔ ہمیں یہ بات برملا کہنے میں کوئی باک نہیں کہ پاکستانی بلکہ انسانی معاشی مسائل کا حل صرف اسلام کی لافانی تعلیمات میں ہے۔ اسلام کا نظام معاش سرمایہ داری کی قارونیت اور مزدکیت و اشتراکیت و اشتمالیت کی طبقاتی چپقلش کو

بیک وقت ختم کر دیتا ہے۔ اسلام نے معاشی ناہمواریوں کا علاج جس عدل و انصاف سے کیا ہے انسانی خود ساختہ نظام اس کا پر کاہ بھی نہیں کر سکتے۔ اسلام ایک طرف نجی ملکیت اور انفرادی عمل پیدائش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے دوسری طرف تقسیم دولت کی ان راہوں کو وجود دبخشتا ہے جن سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہیں رہتی۔ بلکہ ہر شخص کی ضروریات اربعہ (مکان، خوراک، پوشاک اور تعلیم) کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی اور مواسات، بھوک و افلاس کو معاشرہ سے ختم کر دیتی ہے۔ تفصیل کا یہ مقام نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ ناجائز پیداوار دولت کے ذرائع سود، قمار، احتکار، حرام آمدنیوں کو، جن کی کھوکھ سے حرام سرمایہ کاری نے جنم لیا ہے، اسلام نے کس طرح حرام قرار دیا ہے اور آمدنی کے وہ ذرائع جو دولت کو چند افراد کے ہاتھ میں پہنچا دیتے ہیں انہیں کیسے ختم کیا ہے۔ جو دولت کسی کے پاس جمع ہے، اسے معاشرہ میں منتقل کرنے کے لئے زکوٰۃ و عشر، خمس و صدقات، میراث کے لازمی احکام صادر فرمائے۔ مزید برآں خیرات صلہ رحمی، غریبوں کی غمگساری و مدد وغیرہ کی مستقل خیراتی مدیں قائم کیں۔ امیروں کے مال میں ناداروں کا "حصہ و حق" شرعی حدود کے اندر مقرر کیا گیا۔

ناداروں کے مفاد کو مالداروں کا دین قرار دیا اور مالداروں کے حقوق کا پورا کرنا ناداروں کی دینی ذمہ داری قرار دی گئی۔ اسلامی معاشی نظریہ کی جان ہر طبقہ کی ضروریات کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی و مواسات، مواخاۃ و محبت ہے۔ اسلامی معاشی نظریہ انسانوں میں طبقاتی تفریق و منافرت پیدا نہیں کرتا بلکہ ہر طبقہ کو اپنے دائرہ عمل میں افزائش نسل و دولت کے اسباب مہیا کرنے کے ساتھ ان میں ایسی باہمی ہم آہنگی اور جوڑ پیدا کرتا ہے جہاں حسد و رقابت کی بجائے محبت و تعاون کی فضا قائم ہوتی ہے اسلام میں گو مساوات مالی نہیں، لیکن مساوات رتبی اور مساوات قانونی موجود ہے۔ مجلسی رتبہ میں مال و

جائیداد کے اضافی قدروں کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اخلاق و اعمال کی بلندی ''سرفرازی'' کا واحد معیار ہے۔ اسلام میں ملک و مال، جائیداد و جاہ معیار فضیلت نہیں، بلکہ علم و تقویٰ اور اخلاق و اعمال معیار ہیں۔ ایک غیور و دین دار صاحب صلاح و تقویٰ مزدور ایک کروڑ پتی بد اعمال سیٹھ سے اسلام کی نگاہ میں اونچا ہے۔ اسی طرح قانون کی نگاہ میں آقا و غلام، شاہ و گدا سب برابر ہیں۔

اسلام کا معاشی نظام اگر دیانتداری سے نافذ کر دیا جائے تو ایک ایسا ہموار معاشرہ پیدا ہو جائے گا جہاں تمام طبقات باہمی محبت و سلوک و حقوق کی ادائیگی، خدمت اور موانست کی زندگی گزار سکیں، جہاں آقا و غلام کی تمیز نہیں ہو گی اور جہاں ہر شخص خوشحالی، فارغ البالی اور فراوانی کی زندگی گزار رہا ہو گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام کی وسیع سلطنت میں کوئی زکوٰۃ قبول کرنے کے لائق محتاج نہیں رہا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی سلطنت میں موجودہ مغربی پاکستان کی مشرقی سرحدوں سے لے کر اٹلانٹک اور دیوار چین سے لے کر وسط افریقہ اور اندلس تک پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی نادر ایسا نہ ملتا تھا جسے زکوٰۃ و خیرات دی جا سکے۔ یہ اسلامی معاشی نظام کی برکت تھی کہ جب تک مسلمانوں میں اسلامی اقدار کا پاس رہا، طبقاتی منافرت اور مالی حرص و آز کا جہنم وجود میں نہ آسکا۔ اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کا حل نہ سرمایہ داری میں ہے نہ اشتراکیت میں۔ ہم اپنی معاشی تعمیر نو صرف مذہب کے بتائے ہوئے خالص الٰہی اصولوں اور احکام کے مطابق کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہر قدم مزید الجھنوں کا سبب بنتا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہمیں بابائے ملّت کے وہ الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جو انہوں نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی بنیاد رکھتے ہوئے یکم جولائی ۱۹۴۸ء میں اپنی آخری پبلک تقریر میں فرمائے تھے:

''مغربی اقتصادی اصول ہمارے لئے عبرت آموز ہیں جن کی وجہ سے آج دنیا بحران کا شکار ہے۔ آپ کے تحقیقی ادارے کو چاہیے کہ وہ اسلامی

نظریات پر سماجی اور اقتصادی زندگی کی بنیاد رکھے۔ ایک خوشحال اور مطمئن معاشرے کے لیے مغربی اصول کسی طرح مفید نہیں ہو سکتے۔ ہمیں تو ایک نئے طریق کار کو اپنانا چاہیے جو انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔"

ملک میں جرائم کا جو رجحان اور لا قانونیت کا جو میلان پیدا ہو رہا ہے۔ اس کا علاج مذہبی قوانین اور اسلامی شریعت کا نفاذواجرا ہے۔ اسلامی قانون و شریعت کے منافع اور اسلامی نظریہ عدل پر اس مختصر وقت میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم یہ بات بے محابہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ انسانی خود ساختہ قوانین کبھی عادلانہ نہیں ہو سکتے۔ نہ انصاف کے تقاضوں کو کماحقہ پورا کر سکتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر شخص اور ہر انسانی جمعیت و طبقہ کے مخصوص رجحانات و میلانات، تقاضے و مفادات ہوتے ہیں جن سے وہ انسان ہونے کی حیثیت سے کلیۃً کبھی مبرا نہیں ہو سکتا۔ قانون ساز اداروں اور مجالس مقننہ کی روزانہ کی کاروائیاں انسان کی اس بارے میں کوتاہ رسی پر شاہد عدل ہیں۔ ایک ملک کی قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ ایک قانون بناتی ہے۔ وہ طبقہ جس کا وہاں غلبہ اور اکثریت ہوتی ہے، قانون سازی میں اپنے مفاد پر نگاہ رکھتا ہے۔ اگر انصاف ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے تو تاویلات کے پردوں میں اسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آمریت اور فاشزم میں شخص کی انانیت قانون قومی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اگر کوئی سرمایہ دار کی بے جا حفاظت کرتا ہے تو کمیونسٹ "مزدور کسان" کی حدود سے بڑھ کر رعایت کرتے ہیں۔ قانون تو وہی عادلانہ ہو گا جس میں کسی کی رعایت نہ ہو، ملکی رجحان نہ ہو، نسلی میلان نہ ہو، لونی پاس نہ ہو، علاقائی لحاظ نہ ہو، وطنی مفاد نہ ہو، طبقاتی عصبیت نہ ہو، غیر سے مخاصمت نہ ہو، اپنے کی حمایت نہ ہو، کنبہ پروری نہ ہو، دوست نوازی نہ ہو۔ "مفادات خاصہ" کی ناجائز نگرانی نہ ہو، قانون سازی میں مال و جاہ کی طلب نہ ہو، مدح وذم کی پروانہ ہو۔

غرض تمام مفادات سے بالا ہو کر اور ہر رجحان سے تہی خاطر و خالی دماغ ہو کر محض عدل و انصاف کی بقا کے لئے قانون بنائے یہ انسان کی بس کی بات نہیں۔ بلکہ یہ تو اس ذات کا کام ہے جو سب تعلقات سے بری، نہ کسی کا بیٹا، نہ کسی کا باپ، نہ کسی کا رشتہ دار ہو، ہر انفعال سے پاک ہو، خوف و رعایت سے مبرا، نسلی ولونی، ملکی وطنی بندشوں سے پاک ہو اور ہر وہ ذات جو مخلوق کے ظاہر و اندروں اور اس کی جملہ ضروریات اجتماعی و انفرادی سے کلیۃً واقف ہو، عالم السرائر اور مستقبل کے جملہ کوائف و واقعات، حوادث و ضروریات کی جاننے والی ہو، وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔

اللہ تعالیٰ جو قانون دے گا وہ سب انسانیت بلکہ پوری مخلوق کو سامنے رکھ کر اور مستقبل کے وقائع و احوال کو جان کر دیکھ کر دے گا جس میں کسی کی رعایت نہیں ہو گی۔ نہ کسی کا خوف "عدل" میں مانع آیا ہو گا۔ وہ ہر ذاتی مفاد سے خالی ہو کر محض مخلوق پروری اور انسانیت کی داد رسی کے لئے دیا جائے گا۔ اس میں کسی پر ظلم نہیں ہو گا، اس میں استحصال و جبر کے چور دروازے نہیں ہوں گے۔ غرض ملک میں عدل و انصاف کا چلن سرف اسلامی شریعت کے نفاذ سے ہو سکتا ہے۔ تعمیر نو میں مذہبی قانون کے نفاذ کی اس وجہ سے بھی ضرورت ہے کہ "قانون" کی بالا دستی کا تصور احترام قانون پر مبنی ہے اور وہ قانون صرف "خدائی قانون" ہی ہے۔ جسے پاکستان کے مسلمان غیر شعوری طور پر بھی مقدس مانتے ہیں۔ قانون اسلامی کے جملہ فوائد بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم سمجھتا ہوں کہ یہ دو باتیں بھی تعمیر نو کے علم برداروں کی ثاقب نگاہوں کے لئے کافی ہوں گی۔

اس ضمن میں ایک اور بنیادی مسئلہ "قومی اخلاق" کی تعمیر و بقا کا ہے۔ آج ملک میں بد دیانتی، رشوت گراں فروشی، ذخیرہ اندوزی، بے حیائی، ظلم و

زیادتی کے جو بے شمار واقعات ہو رہے ہیں، ان کا علاج بھی اسلامی قانون کا اجرا اور اخلاق کو مذہب کی گرفت میں دینا ہے۔

چھوٹا بڑا مسئلہ نژادِ نو کو اسلامی مزاج پر قائم رکھنا ہے، جیسے کہ عرض کر چکا ہوں۔ مسلمان اور اہل پاکستان کوئی نسلی وطنی قومیت و ملک نہیں بلکہ ان کا وجود صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ نئی پود جس طرح اسلامی عقائد و اعمال سے عاری اور مذہبی اقدار سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ایک نامعلوم عالمگیر ارتداد سے کم نہیں۔ اس ہمہ گیر غفلت کا نتیجہ پاکستان اور نظریہ پاکستان کی تباہی پر منتج ہو سکتا ہے، اس لئے وقت کی سب سے بڑی پکار ہے کہ ہم ہر پاکستانی کو عموماً اور نئی پود کو خصوصاً اسلام کے لافانی اور بے مثال دین و اقدار سے آگاہ اور اس پر عمل پیرا کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے ہمیں اپنے پورے تعلیمی و تربیتی نظام کو ہر سطح پر اسلامی تعلیمات و مزاج کے مطابق بنانا ہوگا۔ آج تک ہم نے اپنے نظام تعلیم میں کوئی اہم اور بنیادی تبدیلی نہیں کی۔ انگریز نے اپنے استعماری مفادات کے لئے جس نظام تعلیم کو رائج کیا تھا، اسی تقویم پارینہ کو ہم آنکھوں سے لگائے ہوئے ہیں اور اسی صد چاک قبا پر پیوند در پیوند لگاتے جاتے ہیں جب تک نظام تعلیم میں بنیادی اصولوں اور اجتہادی تبدیلیاں (جو اسے ہر سطح پر اسلامی مزاج سے ہم آہنگ کر دیں) نہیں کی جائیں گی۔ ملت پاکستانیہ کا بحیثیت مسلمان کے باقی رہنا خام خیالی اور فریب نفس ہے۔

اس سلسلے میں سرکاری ملازمین اور عام اہل کاروں کی دینی تربیت کا مسئلہ ہے۔ کسی ملک کی تعمیر میں سرکاری ملازمیں کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ آج تک ہمارے ہاں یہ طبقہ الاّماشاء اللہ انگریز کے بتائے ہوئے پیش پا افتادہ راستے پر گامزن ہے۔ شخصی مفاد قومی مفاد پر غالب آجاتا ہے اور ''دیانت و امانت'' کے مقدس قلعہ میں ''خوف و لالچ'' سے رخنے پڑ جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ وہ ہمہ گیر خرابیاں ہے جس سے ہر شخص نالاں ہے۔ ضرورت ہے کہ

سرکاری ملازمین کی تربیت میں اسلامی اقدار کو اس طرح سمو دیا جائے کہ خوف خدا اور تقویٰ انہیں ہر غلط جنبشِ قلم اور لغزشِ قدم سے روک دے۔ خشیت الٰہی 'رشوت و ناجائز آمدنی' کے بارے میں ان کے ہاتھوں کو شل کر دے اور کسی کا خوف و دہشت حق گوئی اور جائز دادرسی میں مانع نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہی اور مخلوق کے سامنے شرمندگی کا تصور ان پر اس طرح مستولی ہو کہ وہ قومی، ملکی اور پبلک مفادات کو کسی صورت میں پس پشت ڈالنے کی جرأت و ہمت نہ کر سکیں۔ ان کی زندگی کا مقصد رضائے حق کے حصول کے لئے خدمت خلق ہو۔ یہ بات تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب ہم اپنی اعلیٰ سروسوں سے لے کر ادنیٰ ملازمتوں تک دینی ذہن و مزاج کو عام کر دیں اور اسلامی نظریہ کے مطابق ملازمین محض خدمت خلق اور ادائیگی حقوق کو اپنا فریضہ سمجھیں۔ آج حقوق طلبی کی فضا نے ملک کی بنیادیں ہلا دیں ہیں۔ اس مشکل کا حل ''حقوق رسانی اور ادائیگی حقوق'' کے اسلامی جذبہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ غرض سرکاری ملازمین کے بارے میں جو آج ہنگامہ بپا ہے اس کا علاج صرف مذہبی تربیت اور اسلامی ذہن ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہماری شیر دل افواج کی ہمت و جرأت اسلامی جذبہ شجاعت اور ولولہ شہادت کا ثمرہ ہے۔ اس مختصر وقت میں گنجائش نہیں کہ ''قومی تعمیر نو میں مذہب کی اہمیت'' کے تمام پہلوؤں پر گفتگو بھی کی جاسکے۔ تاہم آخر میں ایک اور اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ وہ اپنے ذرائع ابلاغ کو ''اسلامیانا'' ہے۔ آج ہمارے قومی کردار و اخلاق کی تعمیر و تخریب میں ریڈیو، اخبار و رسائل وغیرہ جو اہم حصہ ادا کر رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عمومی ذہن پر اس کا اثر جتنا دور رس اور نتیجہ خیز ہے اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ جملہ ''ذرائع ابلاغ'' کو مذہبی حدود و قیود کا پابند اور خالص اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات کے پرچار کا ذریعہ بنایا

جائے۔ کسی نظریاتی ملک کی تعمیر نو اسی وقت ممکن ہے جب ان تمام چور دروازوں پر سنگین پہرہ بٹھادیا جائے جہاں سے نظریہ کی تخریب کا اندیشہ ہو۔

پاکستان اور اس کے باشندے ایک درخشندہ مستقبل سے اسی صورت میں ہمکنار ہوسکتے ہیں کہ ہماری تعمیر نو کی بنیاد اسلامی زریں تعلیمات اور مذہب کے تابندہ و روشن احکام پر استوار کی جائے۔ غرض پاکستان کی بقاو ترقی تمام تر ''مذہب'' پر مبنی ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے تعمیر نو کے خاکہ میں سراسر اسلامی رنگ بھرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ پاکستان ایک عظیم مملکت بن سکے اور پاکستانی ملت ایک پر شکوہ عظیم اور مثالی امت کی حیثیت سے دنیا میں ابھر سکے اور آخرت میں بھی سرخرو ہوسکے۔ تاکہ اس کے قیام کا اصل مقصد پورا ہو اور پاکستان اسلامی تہذیب و تمدن، قانون عدل و انصاف اور معاشی ہمواری اور معاشرتی زیبائی کا ''دیرینہ ''نظارہ دنیا کو دکھا سکے۔ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے اور'' تعمیر نو'' کے ناخداؤں اور ملت کے رہنماؤں کو توفیق بخشے کہ پاکستان کی تعمیر نو اسلام کی عظیم تعلیمات کے مطابق کر سکیں۔

(مقالات اشرف، ج:۱، ص:۲۳۴ تا ۲۴۳ ملخصاً)

پیش نظر کتاب ''سیاست کے قرآنی اقدار'' کوئی مسلسل اور مربوط تصنیف نہیں۔ بلکہ بندہ کے بعض مطبوع و غیر مطبوع مضامین کا مجموعہ ہے جو متفرق اوقات میں لکھے گئے۔ اس لیے اس میں تصنیف کی ظاہری و معنوی خوبیاں مفقود ہوں گی۔ تاہم جو کچھ متفرق طور پر پیش کیا گیا ہے، امید یہی ہے کہ اس میں قاری کو اکتاہٹ نہیں ہوگی، کیونکہ ان تحریرات کی بنیاد قرآن مجید ہے اور قرآن مجید کی ایک کھلی وجہ اعجاز اور معنوی حسن یہ بھی ہے کہ انسانی ہدایت کے جملہ نمونے اس میں متفرق رکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے انسانی کاوش میں تفرق و تشتت تو عیب ہے کہ اس میں مضامین کے تفرق و تشتت کے ہوتے ہوئے وہ معجزانہ ربط پیدا کرنا محال ہے جو قرآن مجید کے مضامین میں ہے۔ لیکن مضامین کی قرآنی بنیاد کے پیش نظر یہ توقع کی جاتی ہے کہ قاری اس کو برداشت کرلے گا۔

ان مضامین کو پیش کرنے کا داعیہ اپنے مرشد و مربی حضرت ڈاکٹر فدا محمد مدظلہم کی مجلس عالی میں امت مسلمہ کو درپیش سیاسی بحرانوں پر موقع بموقع آپ کی بصیرت افروز گفتگو سننے سے پیدا ہوا، پہلے پہل بندہ یہ مضامین اپنے اصلاحی سلسلہ کے اجتماعات میں بیان کرتا رہا، جب حضرت مرشدی مدظلہم کی تائید و توثیق حاصل ہوئی تو انہیں مرتب کرکے شائع کرنے کا خیال ہوا۔ حضرت سیدی مدظلہم کی بھی اس نوع کی گفتگو متعدد مجالس میں بندہ نے محفوظ کی، جسے ''نبوی سیاست اور اس سے انحراف کے نتائج'' کے عنوان سے بندہ نے مدون کیا، یہ گفتگو پہلے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہوئی، بعد ازاں اسے حضرت مرشدی مدظلہم کے مجموعہ بیانات ''سخن درویش'' جلد اول کا حصہ بنادیا گیا۔ زیر نظر رسالہ میں وہی گفتگو اس کتاب کے مقدمہ کے طور پر پیش خدمت ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں مضامین قرآنی پر ذاتی غور وخوض کے علاوہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ، ڈاکٹر حمید اللہؒ اور مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کی بعض تحریرات سے بھی استفادہ کیا گیا، جن کے حوالہ جات موقع پر رقم کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی برکت سے اس ادنیٰ کاوش کو اپنے دربار میں قبول و منظور فرمائے اور اسے امت مسلمہ میں سیاسی شعور، امت پنے کی تشکیل، امن وآشتی کے فروغ، مملکت خداداد پاکستان کی تشکیلی بنیادوں پر استحکام اور اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث بنائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین وخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔

محمد طفیل کوہاٹی

ندوۃ التحقیق الاسلامی کوہاٹ

مقدمہ

[بندہ کے شیخ ومربی حضرت ڈاکٹر فدا محمد مدظلہم کے بیشتر بیانات میں سیاسی رہنمائی کے حوالے سے کافی کچھ مواد ملتا ہے، بندہ حضرت کی مجالس وبیانات میں اس حوالے سے جو باتیں سنتا رہا، انہیں ایک مستقل مضمون کی صورت میں "نبوی سیاست اور اس سے انحراف کے نتائج" کے عنوان سے مرتب کیا، یہ مضمون "سخن درویش" جلد اول میں بھی شامل ہے، یہاں موضوع کی مناسبت سے بعض تبدیلیوں اور اضافات کے ساتھ بطور مقدمہ شامل کیا جارہا ہے، امید ہے قارئین کے لیے باعث فائدہ ہوگا۔ محمد طفیل کوہاٹی]

انسانی گروہ بندی کی بنیادیں

پولیٹکل سائنس والوں کا کہنا ہے کہ انسان گروہ پسند حیوان ہے یہ اکیلا نہیں رہ سکتا۔ Man is gregarious animal یہ گروہی اور اِکٹھی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ خاندان کی شکل میں، قوم قبیلے کی شکل میں، گاؤں شہر کی شکل میں، علاقے مُلک کی شکل میں زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اب اس کے اکھٹا ہونے کی بنیادیں ہیں۔ یہ گروہ کن بنیادوں پر بنتے ہیں؟ رنگ، نسل، زبان یا اس جیسا کوئی اور مفاد، انسان اسی بنیاد پر گروہ بندی کرتے ہیں، انسان کے سامنے جو مسائل ہوں، اُن کی بنیاد پر بھی گروہ بنتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی اِن میں اِکٹھا ہونے کی بنیادیں ہوتی ہیں۔ گروہ بندی کا ایک طریقہ کار تو یہ سامنے آیا کہ قومیت، علاقائیت، لسانیت پر گروہ تشکیل دیا جائے۔ گروہ بندی کی ایک بنیاد مفادات اور مختلف مسائل ہیں۔ مثلاً گروہ بن جانا بجلی کی لوڈشیڈنگ کے خلاف، یہ مسائل کی گروہ بندی ہے اور گروہ بندی کی ایک بنیاد ہے مذاہب۔ اِس وقت دنیا کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو دنیا کی چھ ارب آبادی میں سے ایک تہائی مسلمان ہیں، ایک تہائی عیسائی، یہود اور دیگر افراد ہیں جو مذہب کا نام لیتے ہیں اور ایک تہائی لادِین ہیں روس، چین وغیرہ جو اِتھئیسٹ، سوشلسٹ، کمیونسٹ ہوگئے۔ ایک تہائی مسلمانوں کو

لیں اور ایک تہائی دیگر مذاہب کو تو ابھی بھی دو تہائی انسانیت مذاہب کی بنیاد پر منظم ہے۔ انسانیت کی چھ ارب آبادی میں سے چار ارب آبادی مذاہب کی بنیاد پر منظم ہے۔ یہ انسان کی گروہ بندی کی بنیادیں ہیں۔

انسانی تمدن کی تشکیل

جس وقت اس سے گروہ وجود میں آجاتا ہے تو وہ گروہ ایک گروہی زندگی کو لے کر آگے چلتا ہے۔ پھر گروہوں کا آپس میں ٹکراؤ آتا ہے پھر جو غالب ہوتا ہے وہ چھا جاتا ہے، اُسی کے ہاتھ میں سارے وسائل آتے ہیں۔ جو مغلوب ہوتا ہے اُس کو میدان چھوڑنا پڑتا ہے، ماتحت ہونا پڑتا ہے، ذلت اور عاجزی والی زندگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہ اُن کے درمیان رہتے ہوئے جھاڑو دیتے ہوئے، اُن کی فصلیں کھیت کاشت کرتے ہوئے، اُن کے کپڑے دھوتے ہوئے، ان کے اور کام کرتے ہوئے زندگی گزارنے پر آجاتا ہے، تو اِس کو وہ قبول کر لیتے ہیں۔

پھر ان گروہوں کو تمدنی زندگی گزارنے کے لیے ایک تہذیب، ایک ثقافت اور نظم وضبط کی ضرورت ہوتی ہے، جو ان کے لیے اجتماعی وسائل کی تقسیم، مسائل کے پیش نظر وسائل کے استعمال کے لیے ترجیحات کی تعیین، ان کے اندورنی تنازعات کا تصفیہ اور ان کے بیرونی دشمنوں سے ان کی حفاظت کا پورا بندوبست کرے۔ اس کے لیے معاشروں میں قائد و پیشوا سامنے آتے ہیں، جو اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ معاشرے کے مسائل کو حل کرنے اور ان کے وسائل کو درست استعمال کر کے ان کی کامیابی کے لیے بخوبی کام کر سکتے ہیں، اس طرح قیادتیں سامنے آتی ہیں اور ان کے زیر قیادت منظم حکومتیں بنتی ہے۔

سیاست کیا ہے؟

لوگوں کے دینی دنیوی مفاد کا خیال رکھ کر ان کو درست طریقے سے چلانے اور ان کے وسائل سے ان کے مسائل اور ضروریات کے حل کے لیے محنت و کوشش کا یہ سارا عمل 'سیاست' کہلاتا ہے

ایک دفعہ میں نے یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس اور پروفیسروں کے اجتماع میں سوال کیا کہ سیاست کسے کہتے ہیں؟ ایک لڑکا کھڑا ہوا کہ دھوکے، ٹرِکTrick اور جعلسازی سے کام نکالنا۔ میں نے کہا: ماشاء اللہ! واقعی لفظ کا وہی معنی ہوتا ہے جو چاروں طرف وجود میں ہوتا ہے Exist کر رہا ہوتا ہے، چاروں طرف سامنے ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ چونکہ جس ماحول میں ہیں تو آپ واقعی اُسی کو سمجھے ہوئے ہیں، آپ کے نزدیک دھوکہ بازی جعل سازی، Trick، یہ سیاست ہے۔ عموماً لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ سیاست کا معنی چالاکی ہے۔ یعنی عوام، مخالفین اور حکومت کو چکّر دے کر اور Dodge کر کے اپنا مطلب نکالنا۔ اپنا مطلب نکالنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کرنا۔ واقعی کسی لفظ کے لغوی اور اصلی معنی کچھ بھی ہوں معاشرے میں تو اس کے وہی معنی سمجھے جاتے ہیں اور متعارف ہوتے ہیں جس طرح اس لفظ کو عملی طور پر استعمال کیا جارہا ہو۔

لفظ سیاست عربی لحاظ سے ثلاثی مجرّد کا مصدر ہے اور ثلاثی مجرّد کے باب 'فَعَلَ یَفْعُلُ' سے سَاسَ یَسُوْسُ، قَالَ یَقُوْلُ کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ جس کا معنی "چلانا، انتظام کرنا" آتا ہے۔

لغوی اعتبار سے لفظ کا معنی چلانا ہے۔ یعنی انسانوں کو زندگی کی دوڑ میں اس طریقے سے چلانا کہ وہ دنیا و آخرت کے لحاظ سے پورے فوائد حاصل کر کے نقصانات سے بچ کر زندگی گذار لیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کانت بَنو اِسرآئیل تَسُوسُهُمُ الْاَنْبِیَاء بنی اسرآئیل کی سیاست اُن کے پیغمبر کیا کرتے تھے۔ یعنی ان کو چلانے اور ان کی دینی دنیوی نگہداشت کی مکمل ذمہ داری انبیاء کے سپرد تھی۔ انبیاء ان کے بادشاہوں کو چلاتے اور بادشاہ قوموں کو چلاتے۔

مروجہ سیاسی نظام کی بنیادیں

اس چلانے کی ذمہ داریوں میں ایک ذمہ داری قیامِ حکومت بھی ہے۔ اس سلسلے میں اہل سیاست کو عوام کی تائید کی ضرورت ہوتی ہے۔ تائید حاصل کرنے کی ایک مروجہ ترتیب ہے جو دنیادار سیاستدان آزماتے رہتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے آکر ان کے مسائل حل کرنے کے بلند بانگ دعوے کرنا، کوئی سلگتا مسئلہ سامنے آجائے اس کے لئے جلسے جلوس کرنا۔ مخالفین کی برائیوں پر مبالغہ کر کے

تنقید کرنا۔ جھوٹ، فریب، دھوکہ دہی کا بھرپور استعمال کرکے عوام کو الّو بنا کر ان کی رائے اپنی ہم نوا کرنا۔ یہ سیاست دانوں کے نعرے (Slogans) ہوتے ہیں اور کارکردگی کی بنیادیں ہوتی ہیں۔ مروجہ سیاست دان انہی بنیادوں پر لوگوں کو اکٹھا کرتے ہیں اور ان کی تائید حاصل کرتے ہیں۔ تائید کے نتیجے میں قوت حاصل ہو جاتی ہے تو یہ گروہ آگے بڑھ کر غالب ہوتا ہے۔ جس طرح ہٹلر نے کہا:

Germans are the superior people. They have got the right to rule overwhole of the world.

کہ جرمن فوق الفطرت لوگ ہیں اِن کا حق بنتا ہے کہ ساری دنیا پر حکومت کریں۔ تو اس کا سلوگن تھا نیشنلزم۔ طریقہ کار کیا تھا؟ کہ عسکری قوت کو جمع کرکے، یلغار کرکے، کُشت وخون کرکے باقیوں کو زیر کرنا۔ اُس وقت دنیا کی قیادت برطانیہ کر رہا تھا۔ برطانیہ کو اُس کے ساتھ ٹکرانا پڑا۔ ٹکرانے کے لیے صرف اسلحہ اور آدمیوں کی تعداد کافی نہیں ہوتی بلکہ مورال (حوصلہ) کے لیے ان کے پاس کوئی پروگرام، کوئی سلوگن، کوئی منصوبہ اور کوئی نعرہ بھی ہو جس سے اُن کا مورال اُبھرے۔ تو اُنھوں نے اس کے مقابلے میں پیٹریاٹزم (حب الوطنی، وطن کی محبت) کا نعرہ لگایا۔ نیشنلزم کے ساتھ اُنھوں نے پیٹریاٹزم کو ٹکرایا اور لڑایا۔

نبوی سیاست کی بنیادیں

انبیاء علیہم السلام کا بھی کورس ورک ہے اور سلوگن ہے۔ اُن کا کورس ورک اور سلوگن ایمان و تقویٰ، حیا، پرہیز گاری، انصاف، عدل، سچائی، رحم و کرم کو وجود میں لانا ہیں اور خدمت خلق کے ذریعے مخلوق خدا کو راحت وآسانی پہنچانی ہوتی ہے۔ کئی دانشوروں اور فلاسفروں نے ان کو بیان تو ضرور کیا ہے لیکن ان کو وجود میں نہیں لا سکے۔ کیونکہ فلاسفر اور نبی میں اور دانشور اور نبی میں فرق یہی ہوتا ہے کہ دانشور اور فلاسفر صرف نظریہ سامنے لاتا ہے اور نبی اپنے عقیدے اور نظریے کو سامنے لا کر اور اُس پر خود چل کر اور اُس پر جان لگا کر اُس کو نافذ کرکے چھوڑتا ہے۔ ایک اکیلے حضور اقدس ﷺ ایک بات کو کہہ رہے ہیں اور اچھے لوگ، نیک لوگ کہتے ہیں کہ بات تو یہ ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن

یہ وجود میں آنے والی نہیں۔ کیونکہ یہ ایک اکیلا تنہا ہے جب کہ آگے ابو جہل، عتبہ، شیبہ، ولید، سردارانِ قریش، اُن کی معاشی طاقت، اُن کا پیسہ، اُن کی دولت، اُن کا معاشرہ، اُن کی معاشرت، یہ ترتیب چل رہی ہے۔ کیا اس کو یہ ایک اکیلا آدمی حق، سچ، انصاف کی بات سے توڑ دے گا؟

انبیاء علیہم السلام کی سیاست کی بنیادی محنت، ایمان و تقوٰی کی دعوت، اس کا حصول اور خدمت خلق کو معاشرہ میں وجود میں لانا ہے۔ اِس کے نتیجے میں اُن کو تائید حاصل ہوتی ہے۔ نیشنلزم، پیٹریاٹزم، سیکولرزم، سوشلزم، کمیونزم، اِن میں سے کوئی اِزم بھی اتنی تائید نہیں دے سکتا جتنی تائید انبیاء علیہم الصلٰوۃ والسلام کی جدوجہد اُن کو دیتی ہے کہ پھر اُن کے سامنے ازم ٹھہر نہیں سکتے۔ ازم پھر بزن اور Run away ہو جاتے ہیں، اسی لیے دنیائے اسلام میں ساری عمر وہ لوگ کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ جو ایمان و تقوٰی کی محنت کر کے اور لوگوں میں اسی بنیاد پر کام کر کے اِس سے تائید حاصل کرتے رہے ہیں۔

مروجہ سیاسی نظاموں کے مقابلے انبیاء کرام علیہم السلام کی سیاسی ترتیب بالکل جدا ہے۔ وہ انسانوں میں اصلاح کا کام کرتے ہیں اور اس سلسلے میں دعوت الی اللہ کے ذریعے لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ دعوت کو قبول کرنے والوں کی تعلیم کے ذریعے سے تربیت کرتے ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام کے دو بنیادی ہتھیار ہوتے ہیں۔ تیسرا کام جو انبیاء علیہم السلام کرتے ہیں وہ خدمت خلق ہے۔ یہ ہستیاں اخلاص کے ساتھ ایسی خدمتِ خلق کرتی ہیں، کہ اس کے نتیجے میں عوام کے دل ان کی طرف جھک جاتے ہیں۔ اللہ کے ذکر و عبادت میں ایسے منہمک ہو کر لگتے ہیں اور ایسے گڑگڑا کر اللہ تعالٰی کے حضور دعائیں مانگتے ہیں کہ اس کے ذریعے اللہ پاک کی تائید و نصرت ان کا ساتھی اور ان کی ہم نوا بن جاتی ہے۔ یہ سب چیزیں وہ محض اللہ تعالٰی کی رضا کے لئے کرتے ہیں۔ ان کا خیال اس چیز سے کوئی دنیا کا مفاد نہیں ہوتا۔ یہ چیز ان کو عوام میں ایک زبردست تائید دلواتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کو قیادت اور سیادت (Leadership)، رضائے الٰہی کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک اضافی چیز (Biproduct) کے طور پر مل جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کو اللہ تعالٰی معاشرے میں

زبردست سیاسی غلبہ نصیب فرماتے ہیں۔

جب غار حرا میں پہلی وحی اتری اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بار نبوت کے اٹھانے کی فکر نے بے چین کر دیا اور اس حالت میں آپ گھر تشریف لائے، اپنی پریشانی کا اظہار اپنی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کیا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی خاطر کے لیے جو جملے ارشاد فرمائے اور آپ کی جن صفات کا تذکرہ کیا وہ ساری کی ساری صفات خدمت خلق سے متعلق تھیں کہ آپ تہی دستوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، بیواؤں کی خبر گیری کرتے ہیں۔ یتیموں کی کفالت کرتے ہیں، مریضوں کی فکر رکھتے ہیں۔ لہٰذا آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا اس سے معلوم ہوا کہ خدمت خلق ایسا وصف ہے کہ اس سے کافر معاشرے میں بھی نتائج نکلتے ہیں اور کفار کی بھی تائید دلواتا ہے۔ جب اسے مسلمان معاشرے میں برتا جائے تو اس کے نتائج کس قدر ہوں گے۔

نبوی سیاست کے حاملین کی مقبولیت کا راز

دنیائے اسلام کی ساڑھے چودہ سو سالہ تاریخ ان مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو تائید نیز سیادت و قیادت اُن کی دینی قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہوئی۔ جس کی وجہ سے انھوں نے انتہائی کامیاب منتظمین اور فرمانرواوں کا کردار ادا کیا۔

بنی امیہ جن کی حکومت چالو حالات کی بنیاد پر محض ایک اسلامی بادشاہت تھی خلافتِ راشدہ نہیں تھی، ان میں بھی جس شخصیت کو مثالی حکمران مانا گیا ہے اور پانچواں خلیفہ راشد تسلیم کیا گیا ہے وہ عمر بن عبد العزیزؒ ہیں۔ ان کی تائید بھی نام نہاد بادشاہوں کی طرح تائید نہیں تھی بلکہ ان کے تقویٰ اور نبوی ترتیب کے مطابق خلفائے راشدین جیسی تائید تھی۔

بنو عباس کی خلافت جو اسی لاکھ مربع میل پر تھی اور مامون الرشید جو بالکل ساری دنیائے اسلام پر چھایا ہوا بادشاہ تھا جب اس نے دینی نظریات میں تبدیلی کرنے کی کوشش کی اور معتزلہ کا ہم نوا بن بیٹھا تو اس کے مقابلے میں امام احمد بن حنبلؒ اور محمد بن نوحؒ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف انتہائی دبدبے والی عسکری قوت ہے اور دوسری طرف نبوی ہتھیاروں سے لیس صرف دو بندے ہیں، جنہوں نے

بادشاہ کی انتہائی سختیاں اور کوڑے سہے لیکن بالآخر ان کے نبوی ہتھیار قوت دعا نے اپنی کارکردگی دکھائی اور بادشاہ انتہائی جوانی اور صحت کے ہوتے ہوئے بیمار ہو کر موت سے ہمکنار ہوا، میدان صاف ہوا، نبوی ترتیب کے چوتھے ہتھیار قوت دعا نے کارکردگی دکھائی اور پھر جلد ہی ان فقرا کا کلمہ حق ایوانوں میں تسلیم کیا گیا اور معتزلہ پوری سیاسی پشت پناہی کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے۔

ساتویں صدی ہجری میں جب تاتاری یلغار کر کے بغداد کو الٹ کر دنیائے اسلام پر چھا گئے اور مسلمانوں کی فوجیں اور حکومتیں ان کے سامنے مغلوب ہو گئیں اس وقت امیر توزونؒ اور مولانا جلال الدین صاحبؒ نے اس وحشی قوم پر دعوت کا نبوی ہتھیار آزمایا اور پوری قوم کی کایا پلٹ کر اسے اسلام میں داخل کر دیا۔ اس موقعے پر پروفیسر پی کے ہیٹی نے اپنی مشہور تاریخ میں ایک تاریخی اقتباس (Paragraph) لکھا ہے: ”یہ وہ موقع ہے کہ جس موقع پر مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا بلکہ اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ چنانچہ وہ وحشی تاتاری جو مسلمانوں کی فوجوں اور حکومتوں پر غالب آ گئے، مسلمانوں کے علماء کی دعوت کے نتیجے میں پچاس سال نہیں گزرے تھے کہ اسلام میں داخل ہو کر اسلام کے خادم بن گئے“۔

اسی موقع کے لیے علامہ اقبال نے کہا تھا:

ہے عیاں یہ خبر تاتار کے فسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اکبر بادشاہ نے دین میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں لا کر ایک نیا دین ”دین الٰہی“ کے نام سے شروع کر دیا۔ پورے ہندوستان کی فوجی ومالی طاقت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے مقابلے میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانیؒ) نے عوام میں کام شروع کیا۔ نبوی ہتھیار، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تعلّم اور دعا کے ذریعے اللہ کی رضا کی خاطر کام کیا۔ اکبر کے بعد جب اس کا بیٹا جہانگیر بادشاہ بنا تو اس نے حضرت کو گوالیار کی جیل میں ڈال دیا۔ لیکن حضرت کی عوام وخواص میں اتنی مقبولیت ہو گئی کہ جہانگیر کے گورنر اور جرنیل اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پنجاب، سرحد، کشمیر اور افغانستان

کے گورنر مہابت خان نے جو حضرت کے مریدین میں تھا، حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ جہانگیر بادشاہ گرمیاں گزارنے کے لئے کشمیر جاتے ہوئے میری عملداری سے گزرے گا۔ اگر حضرت حکم فرمائیں تو میں اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دوں گا۔ حضرت نے اس کی اجازت نہ دی اور نبوی ترتیب کے آخری ہتھیار دعا کو ترجیح دی۔ چنانچہ جب جہانگیر کشمیر پہنچا تو خود اس کو یا اس کے خاندان میں کسی کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی جس میں جہانگیر کو آگاہ کیا گیا کہ شیخ احمد سرہندیؒ اللہ تعالیٰ کے خاص برگزیدہ بندے ہیں۔ چنانچہ جہانگیر نے واپس آتے ہی حضرت شیخ کو جیل سے نکالا، معافی مانگی اور توبہ تائب ہو کر بیعت ہو گیا۔

ماضی قریب میں جب ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کی علیحدہ حکومت کی آواز اٹھی تو مسلم لیگ بنا کر اس کی قیادت سر آغا خان کو دے دی گئی جو سرے سے مسلمان ہی نہیں تھا۔ اس سے نہ بن پڑی تو انگریزوں کے زیر اثر نوابوں کو اس کی قیادت دے دی گئی۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنی بصیرت سے قائداعظم محمد علی جناح اور نواب لیاقت علی خان اور اکسفورڈ و کیمبرج کے نیز علی گڑھ کے فارغ طلباء کی ایک جماعت (Team) کو میدان میں اتارا۔ انگریز خوش تھا کہ اپنے ہی لوگ میدان میں آ گئے۔ یہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ اور ان کے مریدین کا کمال تھا کہ انھوں نے اپنی بصیرت سے اس بات کو بھانپ لیا کہ یہ نوجوانان انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مخلص مسلمان ہیں۔ صرف اسلامی تعلیمات کی تفصیلات سے ان کو آگاہ ہونے کا موقع نہیں ملا۔ چنانچہ دو تین بار حضرت تھانویؒ کے خلفاء کے ساتھ مذاکرات کے نتیجے میں پوری جماعت اتنی متاثر ہوئی کہ اسلامی رنگ میں رنگ گئی۔ چنانچہ جب پاکستان بنا تو اس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔ یہ حضرت تھانویؒ کے دعوت کے نبوی ہتھیار کا کمال تھا۔

پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے علماء، شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی شفیع صاحبؒ، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا غلام غوث ہزاروی صاحبؒ کی قیادت میں منظم ہو گئے۔ کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد مفتی محمود صاحبؒ، مولانا عبدالحق صاحبؒ بھی شامل ہوئے۔ چنانچہ وہ علمائے کرام جنھوں نے وعظ و تبلیغ، درس و

تدریس اور بیعت و تلقین کے نبوی ہتھیاروں سے معاشرے میں ایک مقام پیدا کیا ہوا تھا، مروجہ جمہوری سیاست کے میدان میں آئے۔ بندہ کو یاد ہے کہ اس وقت یہ نعرہ تھا "ہم آئین اور قانون پر اثر انداز ہونے کی خاطر قوم سے درخواست (Appeal) کرتے ہیں کہ قومی اسمبلی کا ووٹ ہمیں دیں"۔ اگرچہ صوبائی اسمبلیوں میں آدمی کھڑے کئے گئے تھے۔ لیکن کئی جگہوں پر مقامی خوانین کے ساتھ یہ بات طے ہوئی تھی کہ قومی اسمبلی کا ووٹ اگر ہمیں دیں تو ہم صوبائی ممبری میں جو عموماً وزارتوں کے حصول کے لئے ہوتی ہیں آپ سے مقابلہ نہیں کریں گے۔ الیکشن کے نتائج جب سامنے آئے تو قومی اسمبلی میں نمائندگی ملنے کے علاوہ دو صوبوں کی مخلوط صوبائی حکومتیں بھی ملیں۔ جتنے لوگ منتخب ہوئے تھے، مدارس کے علماء یا سلاسل کے مشائخ تھے۔ جو سارا سال چار نبوی ہتھیاروں کو لے کر کام کر رہے ہوتے تھے۔ الیکشن کے دوران ایک مختصر پھیرا سیاسی بھی کر لیتے تھے۔ عوام اس ایک پھیرے کو ہی تسلیم کر لیتے تھے۔ اس پھیرے میں مروجہ سیاسیوں کی طرح لعن طعن، غیبت، عیب جوئی کے قریب بھی نہیں جاتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ کے بارے میں تو بندہ کو یاد ہے کہ اپنی سیاسی جلسوں میں وعظ و نصیحت اور دعا کے علاوہ کچھ بولتے ہی نہیں تھے۔ اس کے باوجود مفتی محمود صاحبؒ نے بھٹو جیسے لیڈر کو شکست دی جبکہ مولانا عبدالحق صاحبؒ نے صوبے کے وزیر اعلیٰ کو پیٹھ کے بل گرایا۔ یہ صوبائی حکومتیں مرکز میں پیپلز پارٹی کی سازشوں اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی زیادتیوں نے چلنے نہ دیں۔ یہ حکومتیں جب ختم ہوئیں تو بعض با اعتماد ساتھیوں نے بتایا کہ بھٹو نے مولانا غلام غوث ہزارویؒ صاحب کے ساتھ رابطہ کیا کہ نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ تو آپ کا معاہدہ پورا ہو چکا۔ سیاست میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی جتنا عرصہ آپ نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت کرتے رہے ہم نے ایسے حالات رکھے ہیں کہ آپ کو حکومت کرنے کب دی۔ اب پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت بنالو۔ بہت اچھا موقعہ تھا پھر حکومت اور وزارتیں مل رہی تھیں لیکن اکابرین نے سوچا کہ اس طرح پارٹی کے بارے میں یہ تاثر پھیلے گا کہ یہ اقتدار کے بھوکے ہیں اور وزارتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔ اس کا پھر یہ

نتیجہ ہوا کہ ۱۹۷۶ء کے انتخابات کے بعد بھٹو کے دھاندلی کے خلاف جب قومی اتحاد بنا تو سب نے مفتی محمود صاحبؒ کو اپنا قائد اور سربراہ تسلیم کیا۔ اس اعزاز کے مقابلے میں وزارتوں اور حکومت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

پنجاب کے ہمارے حضرت مولانا منظور چینوٹی صاحب ٹھیٹھ مدرس عالم، ختم نبوت کے کارکن، شب بیدار عابد اور صاحبِ دعا بندے پنجاب جیسے صوبے میں جہاں مولوی اور عالم کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، نبوی ہتھیاروں کی ترتیب سے اتنی مقبولیت حاصل کئے ہوئے تھے کہ مقامی چودھریوں کو الیکشن میں اس فقیر کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا تھا۔ بندہ کے محبوب، مرشد اور محسن مولانا غلام غوث ہزاروی صاحبؒ تو بندہ کے حلقہ انتخاب کی شخصیت تھے۔ جن کے انفرادی، خاندانی پورے حالات بندہ کے سامنے تھے۔ دو کمروں کے کچے مکان کا رہائشی، جس کے جیب میں کرائے کے پیسے نہیں ہوتے تھے جو کہ نبوی چار ہتھیاروں سے لیس رہتے تھے اور دین کی خاطر جان کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ہمارے حلقے میں اتنے مقبول اور محبوب تھے کہ بڑے بڑے خوانین ان کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتے تھے۔

مروجہ دینی سیاست کی ناکامی کی تشخیص اور علاج

ضرورت ہے کہ اس نہج اور طرز پر کام کرتے ہوئے ایسی شخصیات کو سامنے لایا جائے جنہوں نے پہلے بھی میدان مارا ہے اور اب بھی نتائج نکال کر دکھادیں گے۔

آج جدید دینی سیاست میں 'ساری دنیائے اسلام کی میں بات کر رہا ہوں، یہ نہیں کہ کسی ایک ملک یا پارٹی پر تنقید کر رہا ہوں اور Criticise کر رہا ہوں' وہی کچھ ہو رہا ہے جو چالُو سیاست ہے یعنی Trick دھوکہ بازی، جلسہ جلوس، دھرنیں، مارچیں وغیرہ کو کر، برت کر لوگوں کو اپنے ساتھ کرنا، ایسے لوگوں کو ساتھ ملانا جو مالی وسائل والے ہوں، غنڈہ گردی سے عوام میں شر والا دبدبہ (nuisance value) رکھتے ہوں، اور اس کی وجہ سے ان کے چھانے کے حالات بن رہے ہوں۔ ان باتوں کے ذریعے سے سیاست میں آگے بڑھنا، ساری دنیا میں اسلامی پارٹیوں کی ناکامیابی کی

وجہ یہ ہے کیونکہ اسلامی سیاست تو اپنا ایک خاص طرز (Pattern) رکھتی ہے، اسی پر وہ کامیاب ہوا کرتی ہے۔ ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا اور اپنا احتساب کرنا ہوگا کیونکہ سیاست کا اسلامی طرز یہ ہے کہ پہلے جو کرنے والا آدمی ہے وہ خود اُس کا عملی نمونہ ہو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ آپ نے فلاں جگہ اتنی رشوت لی، فلاں وزارت میں مجھے اتنے پیسے دینے پڑے، آپ کے فلاں وزیر نے یہ چیزیں مانگیں، آپ کے فلاں افسر کو مجھے اتنے دینے پڑے، آپ کی حکومت میں فلاں جگہ میرا یہ حال کیا گیا۔

جس وقت حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں فاطمہ مخزومیہؓ کے ہاتھ کاٹنے کے موقع پر سفارش لائی گئی کہ بڑے اونچے خاندان کی ہے۔ تو فرمایا کہ اگر اس کی جگہ فاطمہؓ بنت محمد ﷺ ہوتی تو اُس کا بھی ہاتھ کاٹا جاتا۔

ایک دفعہ بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ کے پاس کچھ مالی مدد، ملازم مانگنے کے لیے آئیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اِس حال میں آپ کو یہ چیزیں نہیں دے سکتا جبکہ بدر کے شہداء کے بچوں کے پیٹ پیٹھ کے ساتھ لگ رہے ہیں یعنی اتنی بھوک ہے ان پر۔ میں پہلے سارے مال سے اُن لوگوں کے کاموں کو مکمل کروں گا، اُن سے فارغ ہو کر کچھ بچا پھر آپ کو دوں گا۔

میرے بھائیو! ایمان و تقویٰ کا نمونہ بننا پڑتا ہے۔ نبوی سیاست کرنے والا جب ایمان و تقویٰ کی محنت کرتا ہے اور اس بنیاد پر اسے لوگوں میں تائید حاصل ہوتی ہے تو اِس آدمی کو سیاسی جلسے جلوسوں کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ جلسے کرائے، نعرہ بازی کرائے، ہلڑبازی کرائے، دھرنے کرائے اور سیاست کے چالو طرز کو اختیار کرے، اس کی ضرورت اسے نہیں ہوتی کیونکہ اس نے اپنی ایمان و تقویٰ کی محنت کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں گھر کیا ہوا ہوتا ہے اور اپنی عملی زندگی سے لوگوں کو مسخر کیا ہوا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ فالتو کام کرنے کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی کہ یہاں پر طاقت کا مظاہرہ کیا جائے، وہاں پر طاقت کا مظاہرہ کیا جائے۔ تُو اپنی تقویٰ کی طاقت کا مظاہرہ کر! پھر دیکھ کہ آگے کیا اثر آتا ہے، تو پرہیزگاری کی طاقت کا مظاہرہ کر! پھر دیکھ کہ آگے کیا اثر آتا ہے، تُو اپنے انصاف کے طاقت کو آزما کر دیکھ! پھر دیکھ کہ آگے کیا اثر آتا ہے!!!!

ہائے افسوس! جب قدریں بدلتی ہیں، جب سوچیں بدلتی ہیں تو آدمی کی سمجھ پھر کام نہیں کرتی۔ پھر جو چیز چالُو ہوتی ہے اُس کے پیچھے دوڑ رہے ہوتے ہیں اور ہر چالُو چیز کامیاب نہیں ہوتی، ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

تو میرے بھائی! زندگی میں اِس بات کو یاد رکھ کہ ایک اپنے آپ کو نمونہ بنا۔ یہ قانون، یہ آئین، یہ دین، یہ عمل، یہ ایمان، یہ تقوٰی کوئی کرتا ہے کرے، نہیں کرتا نہ کرے، میں نے ضرور کرنا ہے۔ اس کو میں نے اکیلے کرنا ہے۔

نائجیریا میں کچھ لوگ عیسائی سے مسلمان ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد وہاں تبلیغ کا کام کرنے والے ساتھیوں کے پاس آئے اور کہا کہ ہم مسلمان ہوئے لیکن ہم پھر عیسائی بننا چاہتے ہیں، بس آپ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ ساتھیوں نے پوچھا: کیوں؟ اِس پر اُنہوں نے کہا کہ ہم نے جو کچھ اِسلام کے بارے میں پڑھا سُنا تھا، وہ آپ لوگوں میں عملی طور پر نہیں دیکھا لہٰذا ہم واپس جا رہے ہیں۔ ایک سمجھدار ساتھی نے کہا کہ دیکھیں! ہمارا بڑا مرکز دہلی میں ہے، ہمارے دہلی کے بزرگ آنے والے ہیں، وہ جب آجائیں، آپ ان سے ایک ملاقات کر لیں، اس کے بعد جو فیصلہ آپ کا ہو آپ کی مرضی ہے۔ دہلی والے حضرات وہاں پہنچے، اِن لوگوں کو بلایا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے جو کچھ اِسلام کے بارے میں پڑھا سُنا تھا، وہ عملی طور پر نہیں دیکھا لہٰذا ہم واپس عیسائی ہو رہے ہیں۔ حضرات اکابر کو اللہ تعالیٰ نے فہم اور بصیرت دی ہوتی ہے۔ اس وقت کے عالمی امیر حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب نے اُن سے فرمایا کہ ہم آپ سے ایک بات کہتے ہیں: جو کچھ اسلام کے بارے میں آپ نے سنا ہے، اگر یہ ساری دنیا میں وجود میں آجائے تب بھی آپ کو تسلی نہیں ہو گی لیکن اگر آپ اپنی زندگی میں اس کو وجود میں لے آئیں کہ آپ کی اپنی زندگی اس کا نمونہ ہو جائے تو آپ کو مکمل تسلی ہو جائے گی، چاہے باقی کسی میں نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ بس یہ بات ہمیں سمجھ میں آگئی، ہم واپس عیسائی نہیں ہو رہے۔ ہم کوشش کر کے ایمان اور اعمال کو سیکھیں گے اور اپنی زندگیوں میں لائیں گے۔

نبوی اور طاغوتی سیاست کے نتائج کا فرق

نبوی سیاست کے نتائج ہمیشہ لوگوں کے لیے سکھ، چین اور راحت کی شکل میں سامنے آئے ہیں جب کہ مروجہ سیاسی پینتروں سے عالمی سیاسی طاقتوں نے دنیا کا استحصال کیا ہے، ان کے وسائل لوٹے ہے، نسل کشی ہے، ان کی تہذیب وثقافت اور زبانوں کو ختم کیا ہے، کشت وخون کر کے بے گناہوں کو مارا گیا ہے اور لوگوں کا جینا حرام کیا ہے۔ یہ اس طاغوتی سیاست میں غلبہ کے لازمی اجزاء ہیں اور اس شیطانی ترتیب سے ہی غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں ایک کروڑ سے زیادہ مقامی ریڈ انڈینز کو قتل کیا گیا۔ کیونکہ امریکیوں کے پاس آتشین اسلحہ تھا، وہاں گئے اور امریکیوں نے اِن ریڈ انڈینز کو مکھی مچھر کی طرح مارا۔ یہ صرف آج ہی نہیں کہ افغانستان میں بمباری کر رہے ہیں، پاکستان میں ڈرون حملے کر رہے ہیں، ان کی تو بنیاد ہی اس پر ہے، اسی طرح کئی لاکھ آدمی آسٹریلیا میں قتل کئے، کئی لاکھ آدمی جنوبی افریقہ میں قتل کیے ہیں اور اُن کی لاشوں پر اپنے اسلحے کے زور سے حکومتیں قائم کیں۔

جب کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ انقلاب جس نے ایک ہزار سال تک دنیا کو امن و امان کا نظام دیا ہے، ایک ہزار سال تک مسلمان سُپر پاور رہے ہیں، اُس کے بعد اگر عالمی طاقت نہیں بھی رہے پھر بھی علاقائی طاقت ضرور رہے۔ ۱۹۰۰ء کے قریب سلطان عبدالمجید نے فرانس کے بادشاہ کو خط لکھا کہ میں نے سُنا ہے کہ تمہارے مُلک میں لڑکے اور لڑکیوں نے ہاتھ مِلا کر اِکھٹا ڈانس کیا ہے۔ بحیرۂ روم کی سپر پاور ہونے کے ناطے میں تمہیں اس بات کا حکم کرتا ہوں کہ آئندہ تمہارے ملک میں یہ نہیں ہو گا، اس کے خراب اثرات میرے ملک میں آئیں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سارے انقلاب نے ساری دنیا کو متاثر کیا اور ابھی تک اس کے اثرات باقی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے جہادوں میں کفار، مسلمان سب کو ملا کر ۱۰۳۰ لوگوں کی جانیں گئی ہیں، جن میں سات سو سے کچھ اوپر کفار ہیں اور دو سو اٹھاون یا اس سے کم وبیش مسلمان شہداء ہیں۔

چونکہ بنیادی مقصد مرنا مارنا، وسائل پر قبضہ کرنا، انسانوں کو ختم کرنا نہیں تھا بلکہ بنیادی مقصد اصلاح تھا۔ اصلاح کے راستے میں کوئی رکاوٹ ڈالے تو صرف اُس سے ہی لڑنا تھا، کیونکہ اسلام کا بنیادی

مقصد لڑنا، مرنا، مارنا، کُشت وخون نہیں بلکہ افہام تفہیم، صلح آشتی ہے۔ جب اس پروگرام کے خلاف باطل اُٹھتا ہے کہ میں آپ کے اس امن وامان، صلح، آشتی، عدل وانصاف، حق وصداقت کو زور سے روکوں گا اور نہیں چلنے دوں گا تو پھر ہم نے نہیں رُکنا بلکہ اس جگہ مقابلہ کرنا ہوتا ہے وَاَعِدُّو لَهُم مَا استَطَعْتُم جتنا تمہارے پاس اسلحہ ہے اُسے لے کر اللہ کے نام پر کھڑے ہو جاؤ۔

امریکیوں نے جو ایک کروڑ سے زائد ریڈ انڈینز مارے، یہ لوگ تو بغیر نظریے کے تھے، بغیر عقیدے کے تھے، اُن کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی لہٰذا اسلحے کا اسلحے سے مقابلہ تھا اور اسلحے کے مقابلے میں وہ نہ ٹھہر سکے۔ جبکہ یہاں اسلحے کا مقابلہ نظریے سے تھا نظریہ تو بہت جاندار چیز ہوتی ہے۔ اسلحہ جب نظریے کے ساتھ ٹکراتا ہے تو افغانستان جیسے حالات سامنے لاتا ہے جہاں دو دہائیاں اسلحہ نظریے کو کچل نہ سکا۔ نبوی سیاست کی بنیاد اسلحہ، مادی طاقت اور دنیاوی کروفر پر نہیں بلکہ دینی احکام و نظریات کو مضبوطی سے تھامنے پر ہے۔

اہل سیاست و حکومت کے لئے لازمی صفات

نبوی سیاست کے لیے کچھ ضروری اوصاف ہیں، جب تک وہ اوصاف اپنے اندر پیدا نہ کر لئے جائیں، اس لائن میں بندہ کامیابی کے ساتھ بالکل نہیں چل سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْن۔

(الانبیاء:۱۰۵)

ترجمہ: اور تحقیق ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھا کہ بے شک زمین کا اقتدار اللہ اپنے نیک بندوں کو دیتا ہے۔

اللہ پاک کا وعدہ ہے یہ پہلے کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ زمین کا اقتدار نیک لوگوں کو دے گا جب نیک لوگ نہیں ہوں گے تو زمین کو تو اللہ نے سنبھالنا ہے۔ لہٰذا اقتدار کسی نہ کسی کو تو دیا جائے گا جو اپنی من مانی ترتیب سے بدترین نتائج سامنے لائے گا۔ لہٰذا دینی سیاست کرنے والے جب تک نیکی کا وہ معیار اور صفات اپنے اندر پیدا نہ کر لیں، جس پر اقتدار کا وعدہ ہے، وہ جتنی بھی کوشش کر لیں۔ اقتدار

حاصل نہیں کرسکتے۔ اگر حاصل کر بھی لیں تو وہ نتائج حاصل نہیں کر سکیں گے جو نبوی سیاست کا طرہ امتیاز ہیں۔

نیکی کے لیے ایک تعبدی اعمال ہیں، نماز، روزہ، حج، عمرہ۔ آدمی عمرے پر جاتا ہے حج پر جاتا ہے۔ الیکشن میں کھڑا ہوتا ہے ساتھ لکھا ہوتا ہے الحاج فلانا، یہ اس کے ذاتی اعمال ہیں، یہ بھی ضروری ہیں اس لیے کہ جس آدمی کی باجماعت نماز کی گواہی نہ ہو تو اسلامی نظام میں ایسا شخص قطعاً امیدوار نہیں بن سکتا۔ آئین کی ۶۲ اور ۶۳ شق پر اگر عمل درآمد ہو اور کوئی آدمی ہمت کر کے اسے کورٹ میں پلیڈ plead کرے اور اسے لے کر آگے جائے تو یہ بہت مضبوط شق ہے۔ جس آدمی کی جماعت کی نماز کی حاضری نہیں ہے تو اس آدمی کے پاس امیدورای یعنی candidature کا basic criteria نہیں، یعنی امیدوار ہونے کی بنیادی اہلیت ہی نہیں۔

پھر اس کے بعد اہل حکومت وسیاست کے لیے چار مزید صفات کی ضرورت ہوتی ہے: دیانت، امانت، شجاعت، وکالت۔ آدمی دیانتدار ہو، آدمی امانتدار ہو۔ بزدلی نہ دکھائے، دینی مؤقف کی درست وکالت کر سکتا ہو، تبھی وہ سیاست کا اہل ہوتا ہے۔ اگر آدمی نماز تو پڑھتا ہے، حاجی صاحب حج عمرے پر بھی جاتا ہے، اُس نے پگڑی بھی بڑی باندھ دی، لیکن جب وزارت پر بیٹھتا ہے تو رشوت لیتا ہے تو اس کے ذاتی اعمال تو ٹھیک ہیں لیکن دیانت، امانت اس کے پاس نہیں جب کہ دیانت وامانت وہ صفات ہیں جن پر حکومتی سطح پر کوئی سمجھوتہ (compromise) نہیں ہو سکتا۔ دیانت، امانت بہر صورت اسے برتنی ہوگی۔ غبن، دھوکہ دہی، فریب، جھوٹ، ظلم اور خیانت سے قومی وسائل ہتھیانا غلامانہ ذہن، فکری طور پر پسماندہ یعنی احمق وبے وقوف، کم ہمت، اور قومی وملی اہداف سے ناآشنا نااہل لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اجتماعی زندگی میں قطعاً کسی منصب کے اہل نہیں ہوتے، ایسے لوگوں کا تسلط خدائی عذاب ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کو قیادت تک پہنچانے والے اجتماعی گناہ کبیرہ کے مرتکب اور ملت وقوم کے خائن ہوتے ہیں۔

اجتماعی اموال اور قومی خزانے پر دیانت وامانت سے تہی دست لوگوں کا تسلط بالآخر قوموں کو

دوسروں کی غلامی میں دھکیل دیتا ہے، وہ قرضے لے لے کر اور عیاشیاں کر کر کے عوام کو غیروں کی غلامی میں جکڑتے ہیں ، عوامی ضروریات کبھی اس نوعیت کی نہیں ہوتیں کہ ان کے لیے قرضہ لیا جائے۔ یہ قرض اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے لیتے ہیں، ایک طرف سے قرض لیتے ہیں دوسری طرف سے عوام کے خون پسینے کی کمائی لوٹ کر ملک سے باہر پہنچاتے ہیں۔ ہمارے لوگ الحمدللہ ایک سوکھی روٹی اور پانی کے معیار زندگی پر آسکتے ہیں ، اگر نہیں آسکتا تو یہ اہل سیاست اور حکمران نہیں آسکتا، مجھے کوئی ضرورت نہیں آئی ایم ایف کے آگے جھولی پھیلانے کی۔ ضرورت اس کو ہے کیونکہ اس نے عیاشیاں کرنی ہے اور قوم کا پیسہ لوٹنا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَااِیْمَانَ لِمَنْ لَااَمَانَۃَ لَہ۔(مشکوٰۃ)

اس شخص کا ایمان معتبر نہیں جس میں امانت نہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

لَادِیْنَ لِمَنْ عَھْدَ لَہ۔(مشکوٰۃ)

اس شخص کا دین معتبر نہیں جس میں وعدہ کی پاسداری نہیں۔

یاد رکھیں! دیانت و امانت ایمان کے اجزا ہیں، ان میں کوتاہی ایمانی گناہ ہے اور ایمانی گناہ کے ہوتے ہوئے کوئی فرض وواجب قبول نہیں ہوتا، کیونکہ یہ دل کے قصد وارادے سے کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد شجاعت ہے ، اہل سیاست شجاعت سے محروم ہوں، بزدل ہوں تو وہ کبھی اپنی بات اور موٴقف کو جرأت سے پیش نہیں کرسکتے ، ان کی نظر ہمیشہ مادی قوت پر رہتی ہے اور موقع آنے پر میدان چھوڑ کر بزدلوں کی طرح بھاگتے ہیں، ایسے لوگ اس اہل نہیں ہوتے کہ انہیں اقتدار کی کرسی تک پہنچایا جائے ورنہ یہ بزدل عوام کا سودا کر کے انہیں معمولی مفاد کی خاطر بیچ دیتے ہیں، کافر ان پر چڑھ دوڑتا ہے اور یہ مصلحت مصلحت کی رٹ لگاتے ہیں۔ کتنا کمزور حاکم ہوتا ہے کہ رعایا کے آگے جھوٹ بول رہا ہے۔ کافر ذرا دھمکاتا ہے یہ آگے سے ہتھیار ڈالتا ہے جس طرح پرویز مشرف (ایک

فاسق فاجر جرنیل جس نے افغانستان پر حملہ کرنے میں امریکہ کی حمایت کی اور پاکستان کی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت دی) نے امریکی سفیر کے ایک ٹیلیفون پر ہتھیار ڈال دیے۔ کمانڈو جرنیل تھا جی! عام جرنیل بھی نہیں، لیکن کمانڈو تھا بدن کا... دل کو چاہیے ایمان...دل کو چاہیے صداقت، امانت، شجاعت... اقبال نے کہا ہے نا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اگر تیرے سیاست دان کے پاس دیانت، امانت، شجاعت نہیں ہے، کمزور ہے، بزدل ہے تو یہ کسی قابل نہیں۔

اس بات کو یاد رکھنا کہ جن لوگوں سے بد دیانتی ہوئی، جن لوگوں سے بزدلی ہوئی، اس بد دیانتی اور بزدلی والوں پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔

چوتھی چیز وکالت ہے، وکالت کسے کہتے ہیں؟ یعنی کہ آپ کے مسائل کو آگے پلیڈ plead کر سکتا ہو، اسمبلی میں بیان کر سکتا ہو، انٹرنیشنل فورم پر بیان کر سکتا ہو، یونائٹڈ نیشن میں بیان کر سکتا ہو، ہر جگہ آپ کے حق کے لیے بولتا ہو اور پھر اُسے لے کر چھوڑتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ وہ مسائل کا فہم ہی نہ رکھے، اسے ادراک ہی نہ ہو کہ میرے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے، مجھے کیسے اپنا موقف پیش کرنا ہے، دشمن کن کن راستوں سے حملہ آور ہے اور میں نے دلائل کے میدان میں اسے کیسے پچھاڑنا ہے، اس کے داؤ اور گر کیا ہیں، اس کی فہم و فراست ایسی ہو کہ تمام قومی اور عالمی مسائل پر اپنے طبقے کا درست موقف بھرپور وزنی انداز میں سامنے لائے اور اس کے سامنے دنیا کو لاجواب کرے۔ امانت، دیانت، شجاعت اور وکالت یہ چار خصوصیات ہونی چاہئیں تب اہل سیاست و حکومت نبوی طریق کو برت سکتے ہیں اور اس کے نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

حکام، اہل ثروت اور اہل علم کا بگاڑ: قومی تباہی

جب بھی قومی اور ملکی بگاڑ پیدا ہوتا ہے، بحران آتے ہیں، دشمن اور جنگ مسلط ہوتے ہیں، تباہی

آتی ہے اور معاشرے ختم ہوتے ہیں، اس کا سبب اہل سیاست، اہل مال اور اہل علم کا اجتماعی بگاڑ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ قوموں کی تباہی اور زوال کی نشان دہی کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اِذَا اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔ (بنی اسرائیل:۱۶)

"کہ۔ جب ہم نے کسی بستی کو غارت کرنے کا، تباہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے آسودہ لوگوں کو فسق و فجور میں مبتلا کیا کہ اس کے آسودہ لوگ فسق و فجور میں مبتلا ہوئے اور اتنے آگے بڑھے کہ اُن پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ اُن کو جڑوں سے اُکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔"

تو یہ آسودہ لوگ کون ہوتے ہیں؟ یہ تین طبقات ہیں: حکام یعنی اہل سیاست، اہل مال اور اہل علم۔ یہی تین طبقے ہیں جو معاشرہ کی قیادت کرتے ہیں اور معاشرہ اِن کے پیچھے چلتا ہے۔ اِن کی غلطیاں جب حد سے بڑھ جاتی ہیں تو ان پر اللہ تعالیٰ کا ایسا عذاب آتا ہے کہ نیست و نابود کر دیئے جاتے ہیں۔

اہل سیاست اور حکام ظلم اور رشوت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں اقتدار ہے، وہ جو کریں کوئی بول نہیں سکتا۔ پولیس، فوج، اسلحہ، طاقت ان کے پاس ہے۔ لہٰذا اُن سے ظلم ہوتا ہے، ظلم کرتے ہیں، بد دیانتی کرتے ہیں، مال چھیننے کا ظلم، عورتوں پر ہاتھ ڈالنے کا ظلم۔

Corruption of sex, corruption of money .

ہمارے ایک ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں ایم۔ فل کے سلسلے میں کراچی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں پر میں نے عید کی قربانی کی، جب بکرے کی کھال اتاری تو آدمی آ گئے کہ کھال دو۔ میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ اُس نے کہا کہ میں ایم کیو ایم کا آدمی ہوں۔ میں نے بتایا کہ ہم تو کھال دینی مدرسے کو یا کسی غریب مسکین کو دیتے ہیں۔ وہ بولا کہ اپنی کھال دیتے ہو یا یہ؟ (یعنی اِس حد تک غنڈہ گردی ہے) میں نے سوچا کہ یا اللہ! اگرچہ پٹھان آدمی ہوں، ایسے تو ہم شکست نہیں کھایا کرتے لیکن اب

مسافر ہوں اور اِن کے ساتھ اب کُشتی کے حالات نہیں ہو سکتے۔ تو اس نے جبری کھال لے لی۔ ظلم یہاں تک بڑھ جاتا ہے اور بد دیانتی بڑھ جاتی ہے۔

اہل علم کا کیا ہوتا ہے؟ یہ اپنے علم کو چھپاتے ہیں، اقتدار کا ساتھ دیتے ہیں، اور لوگوں کو خوش کرنے کیلئے علم کی ایسی تعبیریں اور تشریحات کرتے ہیں تاکہ یہ مقبول ہوں اور اِن کی اقتدار تک رسائی ہو اور مالدار کیا کرتے ہیں؟ ان کا مال ظلم و ستم کیلئے استعمال ہوتا ہے، فسق و فجور کیلئے استعمال ہوتا ہے، گناہوں کیلئے استعمال ہوتا ہے، ناچ گانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تو کتا بھی موٹر میں بیٹھا ہوا ہے، مکھن اور ٹوسٹ کھا رہا ہے، جبکہ غریب کا بچہ بلک رہا ہے اور چیخیں مار رہا ہے اور اسے کھانا دینے والا کوئی نہیں۔

اہلِ علم بھی ان حکومتوں کے وسائل، بنگلوں، موٹروں کو لینے کے لیے انہیں خوش کرتے ہیں۔ جس وقت ابن علقمی (شیعہ) نے بغداد کی خلافت کے خلاف ہلاکُو کو حملہ کرنے کی دعوت دی تو اُس نے جواب دیا کہ حملہ تو میں کر لوں گا لیکن یہ مسلمانوں کا مرکز ہے، اس میں اِن کے اتنے علماء ہیں، اہلِ حکومت اور فوج کے پیچھے ہٹنے کی صورت میں بھی اگر اِن علماء نے جہاد کا نعرہ لگایا تو سارے عوام کو ہمارے خلاف کر دیں گے۔ ابنِ علقمی نے کہا کہ اِس کا میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ ابنِ علقمی سارے علماء کے پاس گیا اور اُن سے کہا کہ میں نے تمہاری جان بخشی ہلاکو سے کرالی ہے، تم میرے ساتھ جا کر اُس سے مذاکرات کرو۔ اُن علماء کا علمی حال یہ تھا کہ وہ ابنِ علقمی شیعہ (جو اس وقت وزیر اعظم تھا) کی قیادت میں اپنی حکومت کے خلاف یعنی اسلامی حکومت کے خلاف مذاکرات کرنے کے لیے کافر کے پاس گئے! اور جب مذاکرات کے لئے گئے تو اُس آدمی (ہلاکو) نے مسئلے کو فوری حل کر لیا۔ اُس نے سب کی گردنیں مار دیں۔

تو یہ اہلِ علم کی غلطیاں ہوتی ہیں کہ یہ اقتدار تک پہنچنے کے لیے شہرت حاصل کرنے کے لیے اور لوگوں میں مقبول ہونے کے لیے اپنے علم کو چھپاتے ہیں، اُس کی غلط تعبیر کرتے ہیں اور اُس سے انھیں کچھ دولت، کچھ شہرت اور عورت حاصل ہو جاتی ہیں لیکن اللہ پاک کا یہ فیصلہ ہوتا ہے:

اِذَا اَرَدْنَااَنْ نُّهلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَ فِيْهَا فَفَسَقُو فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا القَوْلُ فَدَمَّرنٰهَا تَدْمِيْرًا۔ (بنی اسرآئیل۔۱۶)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس وقت ایک تاتاری بادشاہ (جو مسلمان بھی ہو گیا تھا مگر پھر بھی) اسلامی حکومت پر حملہ کرنے کے لیے آ گیا تو فیصلہ یہ ہوا کہ مسلمان علماء اُس کے پاس جا کر مذاکرات کریں، بات کریں اور اسے حملے سے باز رکھیں۔ جب علماء کے ایک گروہ کے ساتھ میں گیا تو وہاں پر بات کرنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ میں نے اُس کے ظلم و ستم کو، اُس کی کوتاہی کو، اُس کے کُشت و خون کو بیان کیا اور اس کا آخرت میں انجام بیان کیا، جہنم کی ہولناکیاں بیان کیں اور اتنی زوردار اور ڈانٹ ڈپٹ کی باتیں کیں کہ اُسے ہِلا کے رکھ دیا۔ یہ باتیں تاریخ میں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ سارے علماء جو اُن کے ساتھ گئے ہوئے تھے، تھر تھر کانپ رہے تھے کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اُس حاکم کو اللہ نے میرے سامنے توبہ تائب کیا۔ پھر جب ہم واپس آنے لگے تو اُن سب علماء نے کہا کہ تُو تو آج ہماری جان ہی ختم کر رہا تھا، تُو ایسی باتیں کر رہا تھا کہ سب کے قتل کا فیصلہ کرا رہا تھا اس لیے ہم تمہارے ساتھ واپس نہیں جائیں گے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر سارے علیحدہ ہوئے، راستے میں جاتے ہوئے اُن پر ڈاکو پیش آئے اور سوائے شلواروں کے باقی سب کچھ اُن سے لے لیا، اُن کے کُرتے بھی اُتار دیے، اور وہ ایک ایک شلوار پہنے ہوئے بغداد میں داخل ہوئے اور کہتے ہیں کہ میں جب اکیلا داخل ہوا تو بغداد کے گلی کوچوں میں، چھتوں پر، کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے، ساری مخلوق استقبال کے لیے نکلی ہوئی تھی۔ کہا گیا کہ آج وہ آدمی شہر میں داخل ہو رہا ہے جو حق بات کہہ کر آیا ہے۔

تو میرے بھائی! دنیا، دنیادار کے پیچھے اعزاز اور وفا کے لیے نہ بڑھنا! یہ ایک فانی عارضی دھوکا ہے۔ جیسے صحرا دور سے پانی کا تالاب نظر آتا ہے اور جوں قریب جاؤ تو وہ اور دور ہوتا جاتا ہے، آگے ریت ہی ریت ہوتی ہے، یہ دھوکا ہوتا ہے، اِسے سراب کہتے ہیں۔ یہ دنیا سراب ہے، اور جو یہاں اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر غیر اللہ سے کچھ حاصل کرنے کی، اور وہاں سے ترقی و کامیابی کی امیدیں وابستہ کیے ہوئے آگے بڑھے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو توڑے، حضور اکرم ﷺ کے طریقے کو

چھوڑے، نفس کی چاہت اور مزوں کے پیچھے جائے اور لوگوں کو خوش کرنے کے لیے احکامات کو توڑے تو یہ تھوڑا عرصہ سراب کے پیچھے چل رہا ہے، اس کو ظاہری کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ کیونکہ مَن طَلَبَ وَجَدَّ فَقَد وَجَدَ۔ آپ جس چیز کے لئے جدوجہد کریں گے اُس کے نتیجے میں آپ کو کچھ نہ کچھ ملے گا۔ اگر وہ جدوجہد درست ہے تو دائمی، ابدی اور پائیدار ملنا ہو گا اور اگر جدوجہد ناجائز ہے تو وہ عارضی اور ناپائیدار ہو گا، اُس کے نتائج سامنے آجائیں گے۔ زندگی بہت مختصر ہے، اس لیے جب بھی زندگی میں کسی چیز کے لیے قدم اٹھاؤ تو آخرت کی بنیاد پر اُٹھاؤ! اس بات کو سامنے رکھ کہ آخرت میں اس کا کیا انجام ہونے والا ہے اور اگر تیری یہ بات درست ہو گئی، اِس پر تُو چلنے لگ گیا تو جس دنیا سے گھبرا رہا ہے، ڈر رہا ہے اُس کو اللہ پاک درست کر کے تجھے دے گا۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں کہ اے دنیا جو تجھ سے بھاگے فَاخْدِمی اُس کی تو خدمت کر اور جو تیرے پیچھے بھاگ رہا ہو فَاسْتَخْدِمِی اُس کو تُو اپنا خادم اور نوکر بنا کر چھوڑ۔ جو تجھ سے بھاگے اُس کی تو نوکر ہو جا اور جو تیرے پیچھے پڑے اُس کو تو اپنا نوکر بنا دے۔ تاریخ گواہ ہے ساری باتیں ثابت شدہ اور لکھی ہوئی ہیں کہ یہ انجام پہلے لوگوں کا ہوا ہے۔ سکندر مرزا پاکستانی حکومت کا ایک بیوروکریٹ تھا۔ مسلسل سازشوں سے صدر بن گیا تھا۔ اُس نے تقریر کی کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ان مولویوں کو سونے کی کشتی میں بٹھا کر کراچی کے سمندر میں لے جا کر ڈبو دوں۔ مجھے حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب رحمہ اللہ ابھی بھی یاد ہیں، اُس اللہ والے نے کہا کہ ان شاء اللہ اِس کو چاندی کی کشتی میں بٹھا کر ملک بدر کریں گے اور مجھے وہ دن یاد ہے جب وہ ملک بدر ہو رہا تھا۔ اخبار والے تو ہر کسی کو معاف نہیں کرتے، اُن دنوں نسیم حجازی کا کوہستان اخبار ہوتا تھا، ہم پڑھا کرتے تھے۔ کوہستان اخبار والوں نے جاتے ہوئے (اِس کی اور اِس کی بیگم کی) پیچھے سے تصویر لی ہوئی تھی کہ سکندر مرزا ملک چھوڑ کر جا رہا ہے۔ پھر لندن میں اِس نے کوکا کولا کی دُکان پر ویٹر بوائے کا کام کیا ہے، جا کر لوگوں کے آگے میزوں پر بوتلیں رکھتا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اُس کا انجام دِکھایا ہے۔ تو یہ سارے انجام ہمارے سامنے ہیں۔ انہیں سامنے رکھ کر غور کرنا چاہئے، فکر کرنی چاہئے۔ سب سے زیادہ محکم بنیاد یہ سوچ ہے کہ میں جو قدم بھی اُٹھاتا ہوں، جو عمل

بھی کرتا ہوں، اِس کا آخرت میں انجام کیا ہو گا؟ اللہ پاک عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتی وسیاسی جدوجہد کی اقدار

حضرت موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم انبیاء کرام علیہم السلام میں سے ہیں، قرآن مجید میں سب سے زیادہ تذکرہ آپ اور آپ کی قوم کا ہے، قوموں کے عروج وزوال کا اقداری تناظر سمجھنا ہو تو بنی اسرائیل سے متعلقہ قرآنی پیغام کافی و وافی ہے۔ ذیل میں ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحریک دعوت ،بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے کی جانے والی جدوجہد، ان کے خلاف فرعونی سیاست کے کچھ مظاہر اور آپ کی مشہور قرآنی دعا کی روشنی میں آپ کی حکمت عملی کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

حق کی نصرت کا جذبہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے اس حال میں ہجرت کی تھی، جب ان کی قوم غلام ومقہور تھی اور وہ قوم کو آزادی کی راہ پر ڈالنے کے لیے متفکر ہو گئے تھے۔ آپ کا سرِ راہ قبطی سے مخاصمہ، پھر اس کا قتل اپنی قوم کی حمایت وحفاظت اور حق کی نصرت وتعاون کا ایک نمونہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

> حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک عرصہ شاہی تربیت میں بسر کرتے شباب کے دور میں داخل ہوئے، تو نہایت قوی الجثہ اور بہادر جوان نکلے، چہرہ سے رعب ٹپکتا اور گفتگو سے ایک خاص وقار اور شان عظمت ظاہر ہوتی تھی، ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے ان کا کوئی رشتہ قرابت نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور وہ مصر میں نہایت ذلت وغلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر ان کا خون کھولنے لگتا اور موقع بموقع عبرانیوں کی نصرت وحمایت میں پیش پیش

ہو جاتے ۔۔۔ عبرانیوں کے معاملہ میں ان کی نصرت وحمایت کا یہ ثمر ہوا کہ مصری گماشتوں کے مظالم عبرانیوں پر کم ہونے لگے۔

(قصص القرآن، ج:۱، ص:۳۷۵)

سیاسی قیادت کے لیے مطلوبہ اوصاف

قوموں کی سیاسی قیادت کا اصل محرک قوم کی نصرت وحمایت اور تحفظ کا فطری جذبہ ہونا چاہیے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام میں بدرجہ اتم موجود تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جسمانی قوت وطاقت اور جرأت وبسالت بھی ناگزیر ہے تاکہ دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے اور ان کا بھرپور مقابلہ کرنے کی ہمت ہو، اگر قیادت ہی کم ہمت ہو تو قوموں کی ہمت، قربانی اور مر مٹنے کا جذبہ کسی کام کا نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جسمانی و قلبی طاقت کو یہ جوہر بھی بطور خاص عطا ہوا تھا۔ تیسری چیز قیادت کے پاس علم کا نور ہونا چاہیے، اگر وہ علم ودانش کے زیور سے آراستہ نہ ہو تو محض بہادری سے دشمن کی پالیسیوں کا ادارک، ان سے بچاؤ کی راہ معلوم کرنا اور قوم کی اصلاح وارشاد کا کام نہیں کیا جاسکتا۔ چوتھی چیز قیادت میں قوت فیصلہ ہونا ضروری ہے، اگر کوئی شخص صاحب علم ودانش ہے، بہادر ہے، لیکن بروقت درست فیصلہ کی قوت سے محروم ہے تو قوم کی سیاسی قیادت کا قطعاً اہل نہیں، بلکہ ایسا شخص اپنے ناقص فیصلوں اور بے وقت فیصلوں سے قوم کو تباہی کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دربار قدس سے یہ جوہر بھی عطا ہوا اور یہ تمام ہی چیزیں اپنے اعلیٰ اور معجزانہ پیمانے پر نبوت ہی خاصہ ہوتی ہیں۔ قرآنی ارشادات سے واضح ہے کہ یہ انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے محسنین پر ہوتا ہے، جب تک احسان کا معرکہ سر نہ ہو، ایسی قیادت مہیا ہونا یا کسی قیادت میں یہ اوصاف پیدا ہونا ناممکن ہیں۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۔

(قصص:۱۴)

ترجمہ: اور جب موسیٰ پہنچا اپنی قوت کو اور سنبھالا، تو ہم نے اسے بخشا قوت فیصلہ اور علم اور اس

طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

حکومت کے اعلیٰ عہدوں تک افراد کی رسائی: ایک اہم تدبیر

گو کہ اس وقت آپ کو نبوت عطا نہیں ہوئی تھی لیکن اللہ تعالی کی طرف سے عطاشدہ علم و قوت فیصلہ کی بنیاد پر معاشرہ میں آپ کا اثر ورسوخ پیدا ہو چکا تھا، جب آپ نے اپنی قوم کی نصرت وحمایت میں قبطی کا مقابلہ کیا اور وہ اتفاقاً موت کے گھاٹ اتر گیا، پھر یہ راز افشاء ہوا اور فرعونی دربار سے آپ کو قتل کرنے کے احکامات جاری ہوئے، تو اس موقع پر قرآن مجید فرعونی کابینہ میں موجود، حضرت موسی علیہ السلام کے ایک ہمدرد، متحرک لیکن بے نام کردار "رجل" کا تذکرہ کرتا ہے، جس نے اس موقع پر فرعونی اقدامات سے آپ کو آگاہ کرکے آپ کی جان بچانے کا فریضہ انجام دیا اور آپ نے مدین کی طرف ہجرت کی راہ اپنائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ داعی کو اسباب کے درجے میں زمان و مکان کی مقتضایات کا اندازہ لگا کر اپنی عملی سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں پیش آمدہ مشکلات ورکاوٹوں سے اپنے بچاؤ اور دعوتی وسیاسی توسیع کی پوری تدبیر رکھنی چاہیے۔

وَجَآءَ رَجُل مِّنۡ أَقۡصَا ٱلۡمَدِينَةِ يَسۡعَىٰ قَالَ يَٰمُوسَىٰٓ إِنَّ ٱلۡمَلَأَ يَأۡتَمِرُونَ بِكَ لِيَقۡتُلُوكَ فَٱخۡرُجۡ إِنِّي لَكَ مِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ (القصص:۲۰)

ترجمہ: اور شہر کے پرلے سرے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، کہا: اے موسیٰ! دربار والے تیرے متعلق مشورہ کرتے ہیں کہ تجھ کو مار ڈالیں سو نکل۔ بے شک میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں۔

دعوت وسیاست کے اسباب ووسائل کی فراہمی اور تدریب:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کوہ طور کے دامن میں نبوت عطا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرعونی طاغوت کو طغیان وسرکشی سے باز آنے کا دعوتی اور بنی اسرائیل کو اس کے چنگل سے آزادی دلانے، نیز ارض مقدس کو واپس حاصل کرنے کا سیاسی مشن حوالے کیا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو معجزات عطا کیے اور چند ہدایات دیں۔ پہلا معجزہ تو لاٹھی سے اژدھا بننے کا تھا، اس کا مقصد بظاہر یہ سمجھ

میں آتا ہے کہ آگے جاکر فرعونی طاغوت کو برہانی شکست دینے کے لیے اسی معجزہ سے کام لینا تھا، گویا اس کا نظارا کروادیا گیا کہ ایک گونہ اطمینان رہے، دوسرا معجزہ یدِ بیضا کا تھا، جس کا اظہار فرعون کے جادوئی و طلسماتی طاقتوں کے توڑ کے لیے ضروری تھا۔ دربارِ فرعونی میں جانے سے قبل ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دستِ مبارک پر دونوں معجزوں کے اظہار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان سے اُنس پیدا ہوا جو مقابلہ کے لیے اپنے ہتھیار سے پیشگی طور پر ناگزیر ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک داعی کے لیے دعوتِ دین کی راہ میں اپنے دستیاب وسائل و ہتھیار کی خوب جانچ رہنی چاہیے، یہ وسائل و اسباب اور ہتھیار علمی ہوں یا مادی، ان کی ریہرسل داعی کے ولولے کو تازہ رکھتی ہے اور اس میں غلبہ کے لیے درکار قلبی قوت بڑھاتی ہے۔

نیز اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ مقابلہ کے ہتھیار کی تدریب کے بغیر مجاہد کا میدان میں اترنا عین مقابلہ میں حواس باختگی کا سبب بن سکتا ہے اور دشمن کو نفسیاتی طاقت فراہم کر سکتا ہے، بلکہ مقابلہ کے ہتھیار کے بغیر میدان میں مقابلہ نہیں ہوتا محض تماشہ لگتا ہے۔

قَالَ أَلْقِهَا يَامُوسَى ۔ فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَى ۔ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَى ۔ وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَى ۔ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ۔ اذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَى ۔ (طہ:۱۹تا۲۴)

ترجمہ: فرمایا: اے موسیٰ! اسے ڈال دو، پھر اسے ڈال دیا تو اسی وقت وہ دوڑتا ہوا سانپ ہو گیا، فرمایا: اسے پکڑ لے، اور نہ ڈر۔ ہم ابھی اسے پہلی حالت میں پھیر دیں گے اور اپنا ہاتھ اپنے بغل سے ملا دے، بلا عیب سفید ہو کر نکلے گا، یہ دوسری نشانی ہے تاکہ ہم تجھے بڑی نشانیوں میں سے بعض دکھائیں۔ فرعون کے پاس جا۔ بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے۔

دعوتی وسیاسی مشکلات کے سامنے استقلال:

اس موقع پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی کو اژدھا بنتے دیکھا تو طبعی خوف کی

کیفیت پیدا ہوئی، دربار قدس سے "وَلَا تَخَف" کا ارشاد اس بات کی دلیل ہے کہ داعی کو راہ دعوت میں طبعی خوف و پریشانی بھی اضمحلال کا شکار کر سکتی ہے اور یہ اضمحلال نبوی دعوت کے لیے درکار عزم وہمت سے میل نہیں کھاتا، اس لیے خداوند قدوس نے اس کا بھی ازالہ فرمایا، تاکہ دربار فرعونی میں طاغوت کے روبرو عزم واستقلال کے منافی طبعی رجحانات کا بالکلیہ استیصال ہو جائے اور دعوت حق ہر جہت سے مضبوط و مستحکم رہے۔ کیونکہ جس دعوت کے پیچھے داعی کی بھرپور قوت قلبیہ اور بے لغزش عزم کارفرما نہ ہو، مخاطب پر اس کے اثرات کمزور ہوتے ہیں اور وہ باطل کے تار پود بکھیرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ٹھہرتا۔

سیاسی و دعوتی منصب: ایک مسئولیت و ذمہ داری

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب دعوتی وسیاسی تحریک سپرد ہوئی تو آپ نے عرض کیا کہ میں قتل کے الزام میں فرعونی حکومت کو مطلوب ہوں لہذا اتنی اہم ذمہ داری سے سبک دوشی کیسے ممکن ہو سکے گی؟ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت دین کی تحریکوں میں مناصب و عہدے اصل نہیں ہوتے، نہ ہی ان عہدوں کی سپردگی پر خوشی و جشن بندہ مؤمن کو زیب دیتا ہے، بلکہ یہ ایک فرض کی تکمیل کی ذمہ داری ہوتی ہے، داعی کے پیش نظر اس وقت اپنی وہ کوتاہیاں ہونی چاہئیں جو اس منصب کے تقاضوں کو برتنے میں رکاوٹ بن سکتی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی سابقہ پوزیشن کے پیش نظر اس اہم منصب کی انجام دہی خطرے میں نظر آئی تو وضاحت سے عرض کر دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے حفاظت کی ضمانت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آپ ہمہ وقت نگاہ میں ہوں گے، آپ جو کہیں گے وہ براہِ راست سنا جارہا ہو گا اور جو کر رہے ہوں وہ براہ راست دیکھا جارہا ہو گا، یہ بندہ مؤمن کے ایمان کو مزید مستحکم کرنے کی ایک تسلی تھی تاکہ اسے استحضار رہے کہ انسان تو محض بدرجہ سبب استعمال ہوتا ہے، اصل تو ارادہ خداوندی ہی سے ہر چیز کنٹرول ہو رہی ہوتی ہے۔ ان دو ہتھیاروں کے ساتھ خوف کو دور کرنے کا ایک فطری علاج بھی ارشاد فرمایا کہ اگر اس عظیم مشن کے دوران اگر کہیں دشمن کے مقابلہ میں خوف محسوس ہو تو اپنا بازو بدن کے ساتھ ملا لینا اس سے سکینت واطمینان کی ایک کیفیت پیدا

ہو گی اور خوف جاتا رہے گا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ قَتَلۡتُ مِنۡہُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ (قصص:۳۳)

ترجمہ: کہا: اے میرے رب! میں نے ان کے ایک آدمی کو قتل کیا ہے پس میں ڈرتا ہوں کہ مجھے مار ڈالیں گے۔

قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنۡ یَّفۡرُطَ عَلَیۡنَاۤ اَوۡ اَنۡ یَّطۡغٰی ۔قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیۡ مَعَکُمَاۤ اَسۡمَعُ وَ اَرٰی ۔

(طٰہٰ:۴۵،۴۶)

ترجمہ: کہا اے ہمارے رب! ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا یہ کہ زیادہ سرکشی کرے، فرمایا: ڈرو مت۔ میں تمہارے ساتھ سنتا اور دیکھتا ہوں۔

وَّ اضۡمُمۡ اِلَیۡکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّہۡبِ ۔(قصص:۳۲)

ترجمہ: اور اپنی جانب اپنا بازو لے خوف کی حالت میں۔

شدت پسندی: دعوتی و سیاسی تحریکوں کی قاتل

اس موقع پر باری تعالیٰ نے فرعون سے نرم بات کرنے کا ارشاد فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ دعوتی و سیاسی تحریکیں شدت پسندی کی بنیاد پر کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں۔ درشتی، تلخی، جملہ بازی، طعنہ زنی، ذاتیات اچھالنا جس تحریک کا خاصہ ہوں وہ دینی تحریک کبھی نہیں ہو سکتی۔ بات کی شدت، بلاوجہ کی جذباتیت، نکتہ چینی اور حد درجہ تنقیدی نفسیات سے داعی اپنی بات کا وزن کھو دیتا ہے۔ کوئی بات اپنی اندر کتنی ہی معنویت رکھتی ہو لیکن اگر وہ اس طرز و اسلوب پر پیش کی جائے تو انتہائی نامعقول و غیر مدلل ہونے کا تاثر پیدا کر دیتی ہے۔ استاد گرامی مفتی محمد تقی عثمانی مد ظلہم سے بارہا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ مقولہ سنا کہ بات حق ہو، کہنے کی نیت حق ہو اور کہنے کا طریقہ حق ہو تو تب جا کر مخاطب کے دل پر اثر چھوڑتی ہے۔ نیز مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی اکثر سناتے کہ نہ تو آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے داعی ہیں اور نہ ہی آپ کا مخاطب

فرعون سے بڑھ کر گمراہ ہے، جب انہیں نرم بات کرنے کا حکم تھا تو آپ کو بطریق اولیٰ اس کا اہتمام رکھنا چاہیے۔

مزید یہ کہ داعی کی درشتی و تلخی مخاطب کے نفسانی جذبات کو مزید برانگیختہ کر دیتی ہے، وہ غیر جانبدار اور خالی الذہن ہو کر غور و فکر نہیں کر پاتا، وہ داعی کی دعوت کو اپنی ذات و منصب پر حملہ تصور کرتا ہے اور فی الفور رد عمل کی نفسیات کا شکار ہو کر حق کی مقاومت پر اتر آتا ہے، یوں داعی کا اسلوبِ دعوت بذاتِ خود حق کی راہ میں بڑا مانع بن جاتا ہے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۔ (طہٰ:۴۴)

ترجمہ: سو ان سے نرمی سے بات کرو، شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔

دعوتی و سیاسی تحریکوں کا جوہر: نسبت یاداشت

دوسری ہدایت اللہ تعالیٰ نے یہ دی کہ آپ دونوں بھائی (یعنی حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام) اس مشن کے دوران میرے ذکر میں کوتاہی سے بچیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینی تحریکوں میں ہمہ وقت ذکر خداوندی کا ماحول قائم رکھنا ضروری ہے، اس کے بغیر داعی جہاں نفس و شیطان کے دسائس کا شکار ہو سکتا ہے، وہاں دعوت کے زور اور تاثیر میں بھی کمی پیدا ہو سکتی ہے۔

عموماً دعوتی و سیاسی تحریکوں، ادارہ جاتی نظم و انصرام اور اجتماعی نوعیت کے کاموں میں دینی کام کا جوش و خروش خوب غالب ہوتا ہے لیکن ذاتی زندگی میں ذکر و عبادت میں نمایاں کمی رہتی ہے۔ معاشرے میں دینی تحریکات برپا کرنا جان و مال اور وقت کی ایسی قربانی کے متقاضی ہوتے ہیں کہ ان مشاغل کے ساتھ خلوت میں یاد خداوندی، ذکر و مراقبہ، محاسبہ و یکسوئی تقریباً مفقود ہو جاتی ہے یا رسمی نوعیت کی رہ جاتی ہے اور اس کی بجائے اجتماعی نوعیت کی دینی کاوشیں ہی نصب العینی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں۔ داعی کی زندگی میں جلوت و خلوت یا ظاہر و باطن کے تقاضوں کو بیک وقت اعتدال سے بجالانا یقیناً صراط مستقیم کی شکل مثالی ہے اور ایک طرح سے پل صراط عبور کرنے کے مترادف ہے۔ جہاں داعی ان کوششوں میں یاد خداوندی کو فراموش کر دے، تو دعوت کی راہ میں بچھے ہوئے شیطانی و

نفسانی داموں میں اس کے پھنسنے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔

ذکر و فکر کے بغیر داعی میں فقر و زہد، اخلاص و احسان اور دنیا سے بیزاری کے وہ اجزاء بھی پیدا نہیں ہو پاتے جو دعوت دین سے وابستہ معیاری شخصیت کی تشکیل کے لیے لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ کبھی تو اس راہ میں درپیش مادی آزمائشیں اخلاص ہی کا جنازہ نکال دیتی ہیں اور کبھی اخلاص کے باقی رہتے ہوئے بھی صدق و تحقیق کی دولت چھن جاتی ہے اور دعوت دین کی محنت مؤثر نہیں رہ پاتی۔ اس لیے دعوتی تحریکوں میں جہاں تحریکی محنت بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہاں ذاتی زندگی میں دوامِ ذکر و مراقبہ بھی انتہائی ضروری امر ہے۔ خود حضور اقدس ﷺ سے سورۃ انشراح میں ارشاد فرمایا گیا کہ جب آپ معاشرہ میں دعوتی سرگرمیوں سے فراغت پائیں تو اپنے رب کی طرف شوق سے راغب ہو جایا کیجیے۔ مولانا الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ کا معمول تھا کہ وہ دعوتی دوروں سے واپسی پر کچھ وقت تنہائی میں ذکر و مراقبہ کے لیے مختص کرتے تاکہ اجتماع و جلوت میں باطن پر آئے ہوئے منفی اثرات کا ازالہ ہو اور باطن میں یادِ خداوندی کی روشن شمع ماند نہ پڑے۔ ملا محمد عمرؒ کا یہ معمول کئی ثقہ راویوں سے سنا ہے کہ وہ سیاسی دوروں سے واپس آنے اپنے وزراء سے اس وقت تک ملاقات نہیں کرتے تھے، جب تک ان سے خلوت میں کچھ ذکر و اذکار نہ کروا لیتے تاکہ مادی ماحول کے اثرات کا استیصال ہو سکے۔

نیز دعوتی و سیاسی محنت کے دوران جب خدا کی یاد سے قلب و دماغ روشن ہوں اور خدا کی یاد طاری ہو، تو انسان خود کو خدائی حفاظت کے حصار میں محسوس کرتا ہے، اسے استحضار رہتا ہے کہ وہ خدا کا خلیفہ بن کر یہ ذمہ داری نبھا رہا ہے، اس کا اخلاص وللّٰہیت قائم رہنے کے حالات رہتے ہیں اور وہ اپنے دعوتی و سیاسی محنت کے جملہ اچھے نتائج خدا کی ذات کی طرف منسوب کر کے عجب و خودرائی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ (طہ: ۴۲)

ترجمہ: تو اور تیرا بھائی میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یاد میں کوتاہی نہ کرو۔

دعوت وسیاست میں اعتدال کا نسخہ:

فرعونی دربار میں دعوت اور مطالبات خود دربار قدس سے عطا ہوئے کہ ہم اللہ تعالی کے بھیجے ہوئے رسول ہیں، آپ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دیں، ان پر ظلم وستم بند کریں، ہم اپنی حقانیت کی نشانیوں سمیت آئے ہیں، جو لوگ راہ ہدایت کی پیروی کرتے ہیں، سلامتی کی راہ وہی پاتے ہیں اور جو ظلم وطغیان اور تکذیب وتردید پر اڑے رہیں تو عذاب ہی ان کا مقدر ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت کا بنیادی جزؤ صرف معروف سے آگاہی فراہم کرنا نہیں، بلکہ مخاطب میں منکر کی نشان دہی، اس منکر کو چھوڑنے کی ترغیب اور اس منکر پر اصرار کی صورت میں پیش آمدہ خطرات سے آگاہی اور وعید بھی دعوت دین کا لازمہ ہے۔ داعی کے ذمے ہوتا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تقاضوں کو یکساں توجہ دے، اگر اس کی دعوت معروف کی ترویج پر تو مشتمل ہو لیکن منکر پر نکیر کی ہمت نہ پائے اور ظلم پر خاموشی یا سمجھوتہ گوارا کرلے تو حق کبھی قائم نہیں ہو سکتا، اسی طرح اگر معروف کے تقاضے نظر انداز کرکے محض نکیر کی شدت دعوت پر غالب رہے تو دعوتی وسیاسی تحریکیں فساد اور تفرقہ کا باعث بن جاتی ہیں اور دعوت مؤثر نہیں ہوتی۔ اس لیے دربارِ فرعونی میں جہاں معروف کی دعوت دی گئی، ساتھ ہی فرعون کی ظالمانہ پالیسیوں پر نکیر بھی کی گئی۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ داعی کی دعوت انذار وتبشیر دونوں جہتوں پر مشتمل ہونی چاہیے، داعی کا مزاج ترغیب وترہیب کے رویوں سے یکساں گندھا ہوا ہوتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں ہدایت کی پیروی پر سلامتی کی خوشخبری سنائی، وہیں تکذیب وطغیان پر عذاب کی وعید بھی پیش کی۔ صرف ترغیب بعض اوقات بے جا جرأت وبے باکی پیدا کر دیتی ہے اور محض ترہیب وحشت وتعطل، اور یہ ہر دو اثرات دعوت کی نتیجہ خیزی میں مانع ہیں۔

مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ داعی کا کام محض دعوت دینا نہیں بلکہ قوموں کی آزادی وخلاصی اور حق کو اجتماعی سطح پر غالب کرنے کی جدوجہد بھی اس کے دعوتی مشن کے اہداف میں رہنا ضروری ہے۔ دعوت اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہوتی ہے، اس کا مقصد اپنا گروہ بڑھانا نہیں ہوتا۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۰ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۔ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۔

(طہ:۴۷،۴۸)

ترجمہ: سو تم دونوں اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ بے شک ہم تیرے رب کی طرف سے پیغام لے کر آئیں کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دیں اور انہیں تکلیف نہ دیں، ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی اس کے لیے ہے جو سیدھی راہ پر چلے، بے شک ہمیں وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب اسی پر ہوگا جو جھٹلائے اور منہ پھیرے۔

مادی سیاست کا ایک حربہ: فرعونی کم ظرفی

مادی وطاغوتی سیاست کے حاملین کے پاس جب اہل حق کے مؤقف کا کوئی منطقی جواب نہیں ہوتا تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ اہل حق پر اپنے کیے ہوئے کسی احسان کا دباؤ ڈال کر انہیں اپنے مؤقف سے ہٹائیں۔ فرعون کے پاس بنی اسرائیل پر ظلم وجور اور انہیں غلام بنائے رکھنے کی کوئی وجہ ودلیل نہیں تھی، نہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدلل گفتگو کا کوئی جواب تھا تو اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس مطالبے سے پیچھے ہٹانے کے لیے بچپن میں ان پر کیے ہوئے احسانات کا حوالہ دیا اور احسان جتا کر کوشش کی کہ انہیں اپنے معقول مطالبے سے دستبردار کر سکیں، نیز قبطی کے غیر ارادی قتل کا انتہائی مبہم انداز میں حوالہ دے کر مرعوب اور خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی احسان کا اعتراف کیا، قبطی کے غیر ارادی قتل پر اپنی لغزش کو تسلیم کیا، لیکن یہ دونوں باتیں اپنے مؤقف سے دستبرداری میں آڑ بننے نہیں دیں، بلکہ فرعون کو انتہائی معقول جواب دیا کہ میرے اوپر انفرادی احسانات کا کیا یہ بدلہ ہے کہ تم میری قوم کو تمام عمر غلام بنائے رکھو؟ یہ عدل وانصاف کا کون سا پیمانہ ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ مادی سیاست کے حاملین، نبوی سیاست کے حاملین پر اپنے احسانات یا ان کی کسی شخصی کمزوری کو اپنے سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ پہلے تو نبوی سیاست کے حاملین ایسے لوگوں کا کوئی احسان ہی اپنے اوپر نہ لیں، نہ ہی اپنی کوئی شخصی کمزوری ان

کے ہاتھ آنے دیں جسے کل وہ گول مول اور مبہم انداز میں ان کے خلاف استعمال کر سکیں، لیکن اگر بالفرض ایسا اتفاق ہو بھی گیا تو موسوی جرأت کا مظاہرہ کر کے ان سے مرعوب نہ ہوا جائے، کریمانہ اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے احسان کا اعتراف کیا جائے، اپنی لغزش کی بھی کوئی تاویل نہ کی جائے، کیونکہ اس موقع پر اگر تاویل کی راہ اپنائی جائے تو دشمن کی چال کامیاب ہو جاتی ہے اور اصل مقصد اور ہدف سے گفتگو ذاتی دفاع کی طرف مڑ جاتی ہے۔ یوں مقصد کی طرف توجہ کم ہو جاتی ہے اور لوگ ذیلی باتوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں، نیز بلند دعوتی وسیاسی جدوجہد کا محور محض شخصیات کی عقیدت و دفاع رہ جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی سیاست کے اس حربے کو بڑی خوبی سے توڑا اور فرعون کی دونوں باتوں کو تسلیم کر کے گفتگو کو اپنے اصل مقصد اور مطالبے پر لے آئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ اسلوب اس خدائی ہدایت کا بھی نمونہ تھا کہ فرعون سے گفتگو میں نرمی رکھنا۔

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۙ۔ وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۔قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ۔ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۔وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ ۔(شعراء:۱۶تا۲۲)

ترجمہ: پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے، انہوں نے کہا: بے شک ہم جہانوں کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، (یہ پیغام لے کر) کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ چھوڑ دے۔ فرعون نے کہا: کیا ہم نے تجھے اپنے پاس لڑکا سا نہیں پالا؟ اور تو ہمارے یہاں ایک مدت نہیں رہا؟ اور تو نے جو کچھ اس زمانے میں کام کیا وہ تجھے خود بھی معلوم ہے اور تو ناشکر گزار ہے۔ موسیٰ نے کہا: میں وہ کام (قبطی کا قتل) ضرور کیا اور میں اس میں چوک جانے والوں میں سے ہوں، پھر یہاں سے تمہارے خوف کی وجہ سے بھاگ گیا، پھر میرے رب نے مجھے صحیح فیصلہ کی سمجھ دی اور مجھے پیغمبروں میں سے

بنالیا اور میری (پرورش) کا یہ احسان جس کو تو مجھ پر جتا رہا ہے، کیا ایسا احسان ہے کہ (اس کے بدلے) تو بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھے؟

دعوت وسیاست کا جوہر: قوت یقین

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معقول گفتگو کے جواب میں فرعون کی ضد وہٹ دھرمی، گفتگو کو لایعنی سوالات کی طرف موڑ کر عوام کو منطقی مغالطوں میں ڈالنا، قبولیت حق سے انکار اور معجزات کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام سے جادو کی بنیاد پر برہانی مقابلہ کی تیاری پتہ دیتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خداوند کریم نے معاشرہ میں ایسا نفوذ عطا فرمادیا تھا کہ فرعون باوجود قتل کے الزام کے ان کے خلاف کھلی دست اندازی نہ کر سکا اور اس پر مجبور ہوا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کو جادو سے توڑنے کی کوشش کرکے اپنے اقتدار اور بنی اسرائیل کے حوالے سے اپنی پالیسیز کا دفاع کرے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس کی تحدی کو نہ صرف قبول کرنا بلکہ اس کے لیے قومی تہوار کا دن مقرر کرنا تاکہ حق کا غلبہ زیادہ سے زیادہ عوام کرلیں، ان کے قوت یقین کا پتہ دیتی ہے، دعوت دین میں باطل سے ٹکراؤ کا جب بھی مرحلہ آئے، داعی کو طاغوت کے مادی کروفر کی پروا کیے بغیر ایسے ہی قوت یقین کی ضرورت ہوتی ہے، جب اسے اپنے مؤقف کی حقانیت پر یقین ہو تو وہ بند کمروں کی بجائے اعلانیہ مکالمہ ومباحثہ کو ترجیح دے گا۔

طاغوتی سیاست کا سہارا:

عہد فرعونی کا ممتاز فن "جادو وشعبدہ" تھا، فرعون نے اسی فن کے بل بوتے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کی ٹھانی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوی قوتِ معجزہ کو جادو کے تناظر میں ڈیفائن کیا، معلوم ہوا کہ مادیت پرست ہر عہد کے غالب علم وفن سے متاثر ہوتے ہیں، اسی کو معیار مقابلہ تصور کرتے ہیں اور اسی کے بل بوتے پر میدان میں اترتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اس غالب طاقت کا توڑ کسی کے پاس نہیں۔ ہر دور کا ایک طاغوت ہوتا ہے جسے طاغوتی قوتیں حق کے مقابلے میں

سب سے بڑا ہتھیار تصور کرتی ہیں، فرعونی اقتدار کا یہ طاغوت اس دور کا یہی فن تھا، جس کی بنیاد پر فرعون اپنی بقا اور مخالفین کو ناکام کرنے کے لیے پوری طرح مطمئن تھا، جیسے کہ اس عہد کا غالب فن سرمایہ دارانہ اقدار پر کھڑی ٹیکنو سائنس ہے اور اس کا حامل مغرب یہ سمجھتا ہے کہ اقوام عالم کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں، لہذا وہ ہر میدان میں اسی طاغوت کے بل بوتے مطمئن ہو کر میدان میں اترتا ہے، لیکن اس کے لیے بھی ضابطہ وہی ہے کہ خدائی طاقت کے روبرو یہ پرِکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا، بس مقابلہ کے لیے ایمان کی مطلوبہ طاقت درکار ہوتی ہے۔

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ۔قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۔ (طٰہٰ:۵۸،۵۹)

ترجمہ: سو ہم بھی تیرے مقابلے میں ایک ایسا ہی جادو لائیں گے، سو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ مقرر کردے، نہ ہم اس کے خلاف کریں اور نہ تو۔ کسی صاف میدان میں۔ کہا: تمہارا وعدہ جشن کا دن ہے اور دن چڑھے لوگ اکٹھے کیے جائیں۔

مادی وطاغوتی سیاست حق کی حمایت کیسے کم کرتی ہے:

فرعون کا دعوتِ موسوی کو سیاسی رنگ دے کر یہ کہنا کہ تم اس جادو کے زور پر ہم سے اقتدار چھین کر ہمیں اپنے علاقوں سے نکالنا چاہتے ہو، گھاک سیاسیوں کا وہ حربہ ہے جو وہ ہر مخالف کی بات کو کمزور کرنے اور ان کی عوامی حمایت کم کرنے کے لیے آزماتے ہیں۔ نبی کی دعوت اور نرے سیاست دان کی سیاست میں بنیادی فرق یہی ہے کہ نبی کو اپنے دعوتی اہداف عزیز ہوتے ہیں، نبی کو دعوت کے نتیجے میں اقتدار ملنے یا چھوٹنے کا کوئی غم نہیں ہوتا، جب کہ نرے سیاست دان کی جملہ کاوشیں اقتدار کے حصول وبچاؤ کے گرد گھومتی ہیں۔ نبی کی سیاست دعوت سے پھوٹتی ہے جبکہ نرے سیاست دان کے نظریات اور افکار تک سیاسی مفادات کے تابع ہوتے ہیں۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (طٰہٰ:۵۷)

ترجمہ: کہا: اے موسیٰ! کیا تو ہمیں اپنے جادو سے ہمارے ملک سے نکالنے کے لیے آیا ہے۔

مادی و طاغوتی سیاست میں حمایت حاصل کرنے کے طریقے:

فرعون نے اپنی حکومت کے طول و عرض سے جادوگر منگوانا شروع کیے اور ایک بڑی جماعت اکٹھی کر دی، ان جادوگروں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے آمادہ کرنے کے واسطے وہ سارے حربے آزمائے گئے جو مقتدر سیاسی طاقتیں آزماتی ہیں، یعنی مال و دولت اور حکومت میں اہم عہدوں کی پیشکش۔ حق کے مقابلے میں باطل کا دائمی ہتھیار مال و جاہ اور زر وزن رہے ہیں۔ مزہ و مفاد دو ایسی چیزیں ہیں جن کے لیے انسان بڑی سے بڑی حماقت کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جادوگروں نے بھی اپنے فن کی قیمت پہلے طے کروائی، مقتدر طاقتیں رضاکاروں سے محروم ہوتی ہیں وہ کرائے کے جنگجو میدان میں لاتی ہے، جب کہ داعیان حق کو اپنی خدمات مادی قیمتوں کے عوض طے کرانا زیب نہیں دیتا، وہ دینی تحریکوں میں محض اعلاء کلمۃ اللہ کے اپنے تن من دھن کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہی ایک داعی اور ایک ملازم کا فرق ہے۔ داعی کے ذمہ لازم ہوتا ہے کہ بقدر کفاف پر قناعت کرے اور اپنی ساری محنتوں کا صلہ صرف اللہ تعالیٰ سے وصول کرے کہ یہی نبوی مزاج ہے۔ ان اجری الا علی اللہ ۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ۔ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۔وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۔ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۔

(اعراف:۱۱۱تا۱۱۴)

ترجمہ: انہوں نے کہا کہ اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دے اور شہروں میں منادی بھیج دیں تاکہ تیرے پاس ہر ماہر جادوگر کو لے آئیں اور جادوگر فرعون کے پاس آئے، کہا: اگر ہم غالب آئے تو ہمیں کچھ صلہ بھی ملے گا۔ کہا: ہاں! اور بے شک تم مقرب ہو جاؤ گے۔

دعوت وسیاست کی ایک اہم تدبیر: دشمن کی وحدت توڑیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ سے قبل جادوگروں سے مذاکرات کی کوشش اور انہیں دعوت دینا اور عذاب الٰہی کے بارے میں متنبہ کرنا داعی کی اس حکمت عملی کی نشان دہی کرتا ہے کہ دشمن کے اتفاق رائے توڑنے کی کوشش کی جائے، اگر اتفاق رائے اور وحدت کلمہ نہ رہے تو بڑی سے بڑی طاقت واکثریت محض منتشر انبوہ ہوتی ہے اور وہ منظم اقلیت کا مقابلہ نہیں کرپاتی۔ قومیں کثرت سے نہیں وحدتِ کلمہ اور اتفاق رائے سے غلبہ پاتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا اثر یہ ہوا کہ جادوگروں میں چہ می گوئیاں شروع ہوئیں، وہ خفیہ بات چیت کرنے لگے اور ان میں اختلاف وتنازع کھڑا ہوگیا، گو کہ وہ باہم قائل ہوکر مقابلہ کے لیے میدان میں تو آگئے لیکن دعوتِ موسوی نے ان کی اتفاق رائے پر ایسی ضرب لگادی تھی کہ وہ نفسیاتی طور پر کمزور ہوگئے تھے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى۔ (طٰہٰ:۶۱،۶۲)

ترجمہ: موسیٰ نے کہا: افسوس تم اللہ تعالیٰ پر بہتان نہ باندھو ورنہ وہ کسی عذاب سے تمہیں ہلاک کردے گا اور بے شک جس نے جھوٹ بنایا وہ غارت ہوا، پھر ان (جادوگروں) کا آپس میں اختلاف ہو گیا اور خفیہ گفتگو کرتے رہے۔

مدعو قوم کے فنی مہارات کی رعایت:

جب معجزہ کے سامنے جادو کا زور ٹوٹ گیا تو فرعونی جادوگر جو پہلے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر متردد ہوگئے تھے، فوراً معجزہ کی طاقت کے قائل ہوئے اور مشرف بایمان ہوگئے، معلوم ہوا کہ صاحبِ عقل وفن کا ادراک کامل ہوتا ہے۔ فرعون کو معجزہ وجادو کا فرق پتہ نہ چل سکا لیکن جو فن کے ماہر تھے وہ فوراً جانچ گئے۔ لہٰذا جس راہ سے ایمان کی دعوت دی جائے اس میں مدعو کے فنی مزاج کو ملحوظ خاطر رکھنا دعوت کا بنیادی تقاضا ہے۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ ھٰرُوْنَ وَمُوْسٰی۔ (طٰہٰ:۷۰)

ترجمہ: پس جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہا: ہم ہاروں اور موسیٰ کے رب پر ایمان لے آئے۔

طاغوتی و فرعونی سیاست: عوام سے رویہ

جادوگروں کے ایمان لانے پر فرعون حواس باختہ ہو گیا اوراس کی اس وقت کی سیاسی سٹیٹمنٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک جابر ڈکٹیٹر تھا۔ پہلی بات یہ کہی کہ آپ میری اجازت کے بغیر ایمان لانے کا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ گویا فرعونی اقتدار میں حسن و قبح کا منبع فرعون کی ذات تھی، جس چیز کو وہ درست کہتا اسے اختیار کرنا لازم اور جسے وہ غلط کہتا اس سے دور رہنا ضروری۔ شخصی آزادی یا شخصی اختیار و ترجیح کا تصور ہی نہ تھا، نجی فیصلوں میں بھی رعایا سرکاری اجازت کی محتاج تھی، ایسا نجی فیصلہ جو سرکاری رجحانات کے خلاف ہو حکومت کا رٹ چیلنج کرنے بلکہ بغاوت کے زمرے میں شمار ہوتا۔ فرعونی سیاست کے یہی خدوخال آج مغرب کے سیاسی نظاموں میں واضح نظر آتے ہیں، اقوام متحدہ کا چارٹر ہی حسن و قبح کا منبع ہے اور پوری انسانیت کو ان کی خواہشات کے مطابق ترجیحات طے کرنے کی اجازت ہے، اس سے سرمو تجاوز ان پر جنگیں مسلط کرنے اور جینا حرام کر دینے کا باعث بنتا ہے۔ یہ نظام عہد جدید کے نئے سیاسی بت ہیں، جنہوں نے طوعاً و کرہاً انسانیت کو اپنے در پر جھکا رکھا ہے، اس ''شرک'' سے وہی بندہ مؤمن محفوظ ہے جو آج بھی دین اسلام کے مقابلے میں ہر نظام زندگی کے لیے فک کل نظام کا نظریہ رکھتا ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَہٗ قَبْلَ اٰنْ اٰذَنَ لَکُمْ۔ (شعراء:۴۹)

ترجمہ: کہا تم میری اجازت سے پہلے ہی اس پر ایمان لے آئے۔

مادی و فرعونی سیاست میں حق کچلنے کے ہتھکنڈے:

فرعون کا المیہ یہ تھا کہ اس وقت کا دانشور طبقہ جادوگر شمار ہوتے تھے، معاشرہ کی باشعور اکثریت فکری طور پر حکمرانوں کی بجائے اپنے دانشوروں وابستہ ہوتی ہے حکمرانوں کے گرد تو عموماً

مفاد پرست ٹولہ رہتا ہے جیسا کہ وطن خداداد کا معاشرہ مذہبی ہے لہذا یہاں کی ایک بڑی اکثریت اپنے اپنے دائرہ کے اہل مذہب سے وابستہ ہے۔ سلطنت کے طول و عرض سے بلائے گئے جادوگروں کا بیک زبان ایمان لانا فرعون کے لیے ایک بڑا سیاسی بحران پیدا کر سکتا تھا۔ ایسے موقع پر فرعون نے وہی سیاسی حربہ آزمایا جو ڈکٹیٹرز کا طرز عمل ہوتا ہے۔ جادوگروں کو تشدد کر کے شہید کر دیا اور جو لوگ جادوگروں کو دیکھ کر ایمان لانے لگے تھے ان کے خلاف فوری آپریشن کر کے ان کے بچوں کو گرفتار کر کے مارنا شروع کر دیا۔، تاکہ بزور طاقت حق کے غلبے کو روکا جا سکے۔

دوسری طرف قومی رد عمل کو روکنے کے لیے اور قوم کو اعتماد میں لینے کے لیے ایسا سیاسی بیانیہ تراشا جس میں بنیادی عوامی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو پھر سیاسی مخاصمت کا رنگ دے کر قومی ہمدردیاں سمیٹنے کی کوشش کی ۔ کہا کہ یہ جادوگروں کا قتل ایک ایسی سازش کا خاتمہ ہے جو انہوں نے موسیٰ کے ساتھ مل کر کی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اقتدار قبضہ کر کے تمہیں جلاوطن کر دیں اور تمہاری زمینوں کے مالک یہ لوگ بن جائیں، یہ سب موسیٰ کے شاگرد تھے اور اسی نے انہیں جادو سکھایا تھا۔ ان کا میدان مقابلہ میں موسیٰ سے ہارنا محض ایک ڈھونگ تھا، ایک سازش اور تدبیر تھی، جو تمہیں ورغلا کر اپنی حکومت سے باغی کرنے کے لیے رچائی گئی۔ ظاہر ہے ہر فرد کو اپنے وطن سے فطرتاً محبت ہوتی ہے اور کوئی نہیں چاہتا کہ وہ اپنے وطن سے بے گھر ہو، لہذا حق کے مقابلے میں وطنیت و قومیت ایسا ہتھیار ہوتا ہے جو حکمران ایسے مواقع پر استعمال کرتے ہیں، جب سرکاری بیان جاری ہوا کہ سارے جادوگر قومی غدار تھے اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کر رکھا تھا اور یہ سازش پکڑی گئی اور سب مارے گئے۔ تو عوام کا اعتماد بننا ہی تھا۔ مادی سیاست میں عوام کو الو بنا کر اپنا کام نکالنے کے لیے ہمیشہ ہی ایسے جعلی بیانیے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ مادی سیاست میں پروپیگنڈا کے سرکاری وسائل ہمیشہ عوام کی رائے اپنے موافق بنانے اور مخالفین کے خلاف جھوٹ تراشنے میں استعمال ہوتے ہیں لہذا مادی سیاست کے علمبرداروں کے سیاسی بیانیوں پر بالخصوص اپنے مخالفین کے خلاف کبھی اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔

مادی سیاست میں طاقتور طبقہ دلیل کی زبان نہیں سمجھتا، بلکہ وہ کمزور مخالفین کے خلاف من چاہا بیانیہ تشکیل دے کر ان کے منہ پر ڈھٹائی سے پیش کرتا ہے اور انہیں صفائی کا موقع تک نہیں دیتا اور بذریعہ طاقت مخالف کی زبان بند کر دیتا ہے، یہاں تک عوام بھی اس جھوٹ کو سچ مان لیتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ۔(غافر:۲۵)

ترجمہ: پھر جب وہ ہمارے ہاں سے ان کے پاس حق لے کر آیا تو کہنے لگے کہ جو لوگ اس پر ایمان لائے ہیں ان کے بیٹوں کو مار ڈالو اور ان کی لڑکیوں کو باقی رہنے دو، (انجام کار) کافروں کا مکر و فریب برباد ہو کر رہا۔

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى (شعراء: ۴۹)

ترجمہ: بے شک یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا، سو اب میں تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا، اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا اور تمہیں معلوم ہو جائے گا ہم میں سے کس کا عذاب سخت اور دیرپا ہے۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۔ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَا ذَا تَاْمُرُوْنَ ۔(شعراء:۳۵،۳۴)

ترجمہ: فرعون نے اپنے گرد درباریوں سے کہا: بے شک! یہ بڑا عالم جادوگر ہے، یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے ذریعے تمہیں تمہارے وطن سے نکال دے، پس تمہاری کیا رائے ہے۔

مادی سیاست: افضلیت کے پیمانے

مادی سیاست کی ایک منفی ترتیب یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ نبوی سیاست کے حاملین کے ساتھ اپنا موازنہ مادی بنیادوں پر کرتے ہیں۔ دوسرا وہ مخالفین کی ذاتیات پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذاتیات پر دو باتوں کو بنیاد بنا کر تبصرہ کیا۔

ایک تو اس نے اپنے طرز زندگی، مادی کروفر، لباس وسامان آسائش اور اقتدار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنا موازنہ کیا اور قوم کو بلا کر ان کے سامنے اپنی افضلیت پر یہ دلیل رکھی کہ دیکھیں! مصر کا قتدار میرے پاس ہے، نہریں میرے نیچے چلتی ہیں، اگر یہ موسیٰ افضل ہوتا تو اسے سونے کے کنگن پہنائے جاتے اور فرشتوں کے دستے اس کے آگے پیچھے چلتے۔ اس کے پاس یہ پروٹوکول نہیں جبکہ میرے پاس ہے، یہ تو معاذاللہ مہین یعنی تہی دست وقلاش ہے، ایسا شخص قوم کی قیادت اور رہنمائی کا اہل کیونکر ہو سکتا ہے؟ اب آپ بتاؤ کہ افضل کون ہوا؟ مادیت پرستوں کا ذہن مادی پیمانوں سے اوپر نہیں اٹھتا، ان کی فکر پیٹ سے شروع ہو کر شرم گاہ پر ختم ہوتی ہے۔ لہذا ساری قوم فرعون کے اس مادی بیانیے کے سامنے بے وقوف بن کر اور سر جھکا کر معاذ اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے مقابلے میں واقعی ہی کم تر سمجھنے لگی۔ قرآن مجید نے شہادت دی کہ یہ فاسق تھے جو ایسی غیر منطقی گفتگو سے بے وقف بن گئے، اگر ان کے پاس علم ودانش ہوتا تو قطعاً ان مادی پیمانوں پر ایمان نہ لاتے۔

مادی پیمانوں اور طرز زندگی کے تفاوت پر مقابل کے ساتھ موازنہ فرعونی سیاست کا خاصہ ہے۔ جن لوگوں کے پاس معنوی خصائص، صلاحیتیں اور امتیازات نہیں ہوتے، ان کا تکبر وتجبر انہیں یہی سجھاتا ہے کہ وہ خود کو مادی پیمانوں پر تول کر بڑا اور بھاری ثابت کرنے کی ناکام کوشش کریں، حقیقت اور معقولیت یہی ہے کہ کہ شخصیت کی وجاہت مال ومتاع سے نہیں معنوی خصوصیات سے بنتی ہے۔

دوسری بات فرعون نے یہ کہی کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی بات واضح طریقے سے پیش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اُپنے انبیاء کرام کو معنوی کمالات کے ساتھ جسمانی خصوصیات میں بھی سب سے فائق رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عقدہ لسان اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاواحلل عقدة من لسانی کے جواب میں قد اوتیت سؤلک یاموسیٰ۔(طہ:۳۶)[موسیٰ! تم نے جو کچھ مانگا، تمہیں دے دیا گیا۔] فرما کر زائل کر دیا تھا اور فرعونی دبار میں اپنا مؤقف رکھتے وقت حضرت موسیٰ علیہ

السلام کی طلاقت لسانی میں کوئی کمزوری نہ تھی، لیکن باوجود اس کے ماضی کے اس جسمانی عارضہ کو فرعون نے عوام کے سامنے اپنی فضیلت اور موسیٰ علیہ السلام کا عیب بنا کر پیش کیا۔ مادی سیاست میں نرے سیاست دان کے پاس جب دلیل باقی نہ رہے اور مخالف کو کوئی معقول جواب دینے کی پوزیشن میں نہ رہے تو وہ طبعی شرافت بھی کھو دیتا ہے اور اپنی دلیل کی کمزوری کو ایسی لچر اور واہیات گفتگو میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے، اس کا حربہ آسانی سے کامیاب ہو جاتا ہے جب سننے والے اس کی مادی شوکت سے مرعوب، جاہل اور اندھے عقیدت مند ہوں۔ دلیل کی زبان چھوڑ کر ذتیات پر اتر آنا فرعونی سیاست کا خاصہ ہے اور انسان کے بے دلیل، بے تکا اور غیر معقول ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ فرعونی سیاست میں مخالف کے عیوب تو درکنار اس کے جسمانی عوارض اور بیماریوں تک کو بیانوں اور تقریروں کا موضوع بنا کر اس پر داد تحسین سمیٹی جاتی ہے اور اس عنوان پر جاہل عوام میں اپنی تائید پیدا کرنا بڑی فتح شمار کی جاتی ہے۔

وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ ۔ فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ۔ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۔

(زخرف:۵۱تا۵۴)

ترجمہ: اور فرعون اپنی قوم میں پکارا کہ اے میری قوم! کیا میرے لیے مصر کی سلطنت نہیں؟ اور یہ نہریں جو میرے نیچے بہتی ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں۔ یا میں بہتر ہوں اس سے جو کہ حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھل کر کہنا اس کے لیے مشکل ہے۔ تو اسے کیوں نہ پہنائے گئے سونے کی کنگن یا اس کے ساتھ پاس رہنے والے فرشتے آتے۔ پھر اس نے اپنی قوم کو بے وقوف بنالیا اور اس کے کہنے پر چلے، بے شک وہ فاسق قوم تھی۔

سیاسی جدوجہد میں قوم کی غلامانہ سوچ سے پیدا ہونے والی رکاوٹیں

صالح سیاسی قیادت کے سامنے یہ مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں اسے رعایا،

عوام اور قوم کیسی ملتی ہے؟ اگر قوم کی سوچ غلامانہ ہو تو قیادت کو دوہری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

"تاریخ کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی کی حالت میں صدیاں گزر جاتی ہیں تو اس کی زبوں حالی اور پستی کے حدود یہیں ختم نہیں ہو جاتے کہ وہ مفلس وبدحال ہوں اور کاہل و پریشان بال، بلکہ ان کے قوائے عملی کی خرابی سے زیادہ ان کے قوائے دماغی بیکار، مضمحل اور ناکارہ ہو جاتے ہیں، ان میں ہمت وشجاعت مفقود ہو جاتی ہے اور وہ پستی پر ہی قناعت کر لیتے ہیں، ناامیدی ان کا شیوہ ہو جاتا ہے اور ذلت ونکبت کو وہ صبر وقناعت سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے جب کوئی مصلح یا پیغمبر ورسول اس دماغی و عملی پستی سے نکالنے کے لیے ان کو پکارتا اور ہمت وشجاعت پر آمادہ کرتا ہے تو یہ ان کے لیے سب سے مشکل اور ناممکن العمل پیغام نظر آتا ہے اور کبھی وہ اس راہ کی سختیوں سے گھبرا کر آپس میں دست بہ گریباں ہونے لگتے اور کبھی اپنے نجات دہندہ پر شک وشبہ کی نگاہ ڈالنے لگتے ہیں اور اس جدوجہد میں ان کو کوئی فائدہ حاصل ہو جاتا ہے تو وقار وسنجیدگی سے بھی آگے گزر کر اظہار مسرت کرنے لگتے ہیں اور اگر اس راہ میں کوئی آزمائش اور مصیبت کا سوال آپڑتا ہے تو مصلح یا پیغمبر کو الزام دینے لگتے ہیں کہ ہم کو خواہ مخواہ تو نے اس مصیبت میں پھنسایا، ہم تو اپنی حالت پر ہی صابر وشاکر تھے۔ "(قصص القرآن، ج:۱، ص:۴۳۸، ۴۳۷)

جب حضرت موسی علیہ السلام کو فرعونی عزائم سے آگاہی ہوئی تو آپ نے قوم کو توکل علی اللہ اور صبر کی تلقین کی، لیکن قوم نے بڑی بے زاری سے جواب دیا کہ تیرے آنے کچھ امید بندھی تھی لیکن ہم پر تو مصیبتیں مزید بڑھ گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی یہ مایوسانہ کیفیات دیکھ کر انہیں تسلی دی کہ زمین کا مالک فرعون یا اس کی قوم نہیں بلکہ خداوند قدوس ہے وہ جسے چاہے اس کا

اقتدار بخش دے۔ قوم کے رویے پر حضرت موسی علیہ السلام جھنجھلائے نہیں بلکہ بڑی نرمی سے ترغیب دے کر ان کی مایوسی کو دور کرنے کی کوشش کی۔

اپنی تہذیب وتمدن بھلا کر جب اغیار کے غلبہ میں طویل عرصہ گزرتا ہے تو قوموں میں بے صبری پیدا ہو جاتی ہے، وہ دونوں میں کایاپلٹ دیکھنا چاہتے ہیں، ان میں استقلال وثبات باقی نہیں رہتا، وہ نتائج پرست ہوتے ہیں، جب نتائج میں تاخیر دیکھتے ہیں تو استقامت سے جہد مسلسل کی بجائے مایوس وبے دل ہو جاتے ہیں اور طویل المدتی منصوبوں کے تحت کام پر خود کو آمادہ نہیں کر پاتے۔ حالانکہ پیچیدہ اور عمیق بحرانوں سے نکلنے کے لیے صبر وثبات اور مستقل مزاجی سے مسلسل جدوجہد لازمی و ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کوئی سیاسی کوشش بارآور نہیں ہوتی۔

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۖ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۖ قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔(الاعراف:۱۲۹،۱۲۸)

ترجمہ: موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو، بلاشبہ زمین اللہ کی ملک ہے وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے وارث بنادیتا ہے، اور انجام کی کامیابی متقیوں کے لیے ہی ہے۔ انہوں نے جواب دیا: تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت میں تھے اور تیرے آنے کے بعد بھی ہم مصیبت میں گرفتار ہیں۔ موسیٰ نے کہا: وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو برباد کردے گا اور تم کو اس زمین کا خلیفہ بنادے گا اور پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔

سیاسی جدوجہد میں قومی تنظیم کے مواقع کا فائدہ اٹھائیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے جادوگروں کی شہادت ایک عظیم سانحہ تھا، فرعونی ظلم وجبر سر چڑھ کر بول رہا تھا، ایسے موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی معیشت کی تباہی کی دعا مانگی، فرعونیوں کو اللہ تعالیٰ نے قحط سالی سمیت مختلف عذابوں میں جکڑ لیا۔ یہ ایسا وقفہ تھا جب ان کی توجہ بنی اسرائیل کی طرف سے قدرے کم ہوئی۔ سیاسی جدوجہد میں اہل حق ایسے مواقع کو

ضائع نہیں کرتے، نہ ہی آرام طلبی کا شکار ہوتے ہیں، بلکہ اس میں اپنی قومی تنظیم نو اور تعلیم وتربیت کا کام لیتے ہیں تاکہ مستقبل کے لیے درکار معنوی صلاحیتوں کی نمو وپرداخت کا کام کیا جاسکے۔

اس سے قبل ہی موسیٰ علیہ السلام کو قوم کی جدید آبادکاری کا حکم مل چکا تھا۔ الٰہی ارشادات کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس وقفہ کو قومی تنظیم کے لیے استعمال کیا۔ آپ نے قوم کو سمجھایا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ بنی اسرائیل اور قبطی اہل ایمان کو فرعون کے چنگل سے محفوظ نکالا جاسکے، مزید جہد وجہاد اور استقلال کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم مصر میں گھر بناؤ، کسی قوم کو ایک ہی علاقہ میں اکٹھا کرنا ان کی وحدت ونظم کے انتہائی ضروری ہوتا ہے، مستقبل میں پوری قوم کو ایک ساتھ نکالنا تھا، اس کے ضروری تھا کہ ان کی نئی آبادکاری ہو اور انہیں ایک ہی جگہ گھر تعمیر کرکے رہائش مہیا کی جائے۔

دوسرا ان گھروں کو قبلہ رخ بنانے کا حکم دیا گیا، تاکہ گھر مساجد وعبادت گاہ کا کام دیں اور اجتماعی عبادت کے عدم امکان کی وجہ سے انفرادی طور پر ہر گھر مرکز ہدایت ہو جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت سے روح کو سرشار رکھا جائے اور قوت قلبیہ کی فراہمی کا بندوبست کیا جائے، نیز تعلیم وتربیت کے ذریعے نسل نو کی اعتقادی، نظریاتی اور فکری تربیت کا کام کیا جاسکے۔

دعوتی وسیاسی جدوجہد میں ایسے مواقع پر جہاں دشمن کے جبر کے تحت آزادانہ عبادت اور تعلیم وتربیت کے امکانات معدوم ہوں، گھر گھر کو تعلیم گاہ میں بدل دینا چاہیے اور چار دیواری میں خفیہ طور پر یہ سرگرمی انجام دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے عبادت کا تعلق اور تعلیم وتربیت ایسی چیزیں نہیں کہ حالات کے جبر کا بہانہ بناکر ان میں تاخیر گوارا کی جائے۔ حضور اقدس ﷺ نے مکی دور میں اسی منہج پر صحابہ کی تعلیم وتربیت کا انتظام فرمایا۔

وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَ اَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔وَ قَالَ مُوْسٰی رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِیْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۙ رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤی اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی

يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۔قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

(یونس:۸۷تا۸۹)

ترجمہ:اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون پر وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں مکان بناؤاور ان کو قبلہ رخ تعمیر کرو اور ان میں نماز قائم کرو اور ایمان والوں کو خوشخبری دو۔ اور موسیٰ نے کہا: اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو اس دنیا کی زندگی میں زیب وزینت کی چیزیں اور مال و دولت کی شوکتیں بخشی ہیں، اے ہمارے رب! کیا یہ اس لیے ہیں کہ تیرے راستے سے یہ لوگوں کو گمراہ کریں، اے ہمارے رب! ان کی دولت کو تہس نہس کر دے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دے کہ اس وقت تک یقین نہ کریں کہ جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تم دونوں کی دعا قبول کی تو اب تم دونوں جم کر کھڑے ہو اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرو جو میرا طریقہ کار نہیں جانتے۔

نبوی سیاست کے ساتھ حمایت حق

ایک اہم سوال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کے خلاف فرعون اس قسم کے آپریشن پر قادر کیوں نہ ہو سکا جو اس نے اپنی رعایا یعنی جادوگروں کے خلاف کیا۔ حالانکہ اس کی قوم کا اس سے مطالبہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیں۔ اس کی اصل وجہ وہ نصرت خداوندی کا وعدہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا کہ آپ بے خوف ہو کے فرعون کے سامنے جائیں ہم آپ کو سن رہے ہیں اور آپ ہماری نگاہ میں ہیں۔ ظاہر ہے نگاہ خداوندی کے ہوتے ہوئے فرعون کی کیا مجال ہو سکتی تھی۔

دوسرا فرعون کا طبعی خوف تھا کہ جادوگروں کو تو مزید زندہ رہنے کا موقع دینا اس کے لیے ایک بڑے بحران کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی ترویج کا ایک بڑا ذریعہ بن سکتا تھا، اس لیے اس نے ان امکانات کو ہی ختم دینے کی ٹھانی اور ایک جھوٹے بیانیہ کا سہارا لے راہ ایمان کے ان اولوالعزم بہادروں کو بے دردی سے شہید کر دیا۔ اس قربانی کا نتیجہ تھا کہ بنی اسرائیل کی خلاصی کا

سیاسی مشن مزید مضبوط ہوا۔ لیکن فرعون اظہار حق کے اس کھلے مظاہرے سے اتنا مرعوب تھا کہ قوم کے مطالبے کے باوجود کہ موسیٰ کو قتل کیوں نہیں کرا دیتا، کیا اس کو اور اس کی قوم کو مزید موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ ملک میں فساد مچائیں؟ تو اس نے محض اس سیاسی بیانیے سے قوم کو مطمئن کر دیا کہ تم کیوں خوف کھاتے ہو؟ میں بنی اسرائیل کی طاقت کچل دوں گا، انہیں مقاومت کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گا، لہذا یہ حکم نامہ جاری کر دیا کہ ان کی نرینہ اولاد کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے اور بچیوں کو رہنے دیا جائے، تاکہ مردوں کی کمی اور خواتین کی کثرت سے ان پر معاشی دباؤ بھی پڑے، نیز ان سے بیگار بھی لیا جاتا رہے۔ فرعونی سیاست کی حامل طاقتیں مخالفین کی نسل کشی کے اسی منشور پر آج تک عمل پیرا ہیں۔

نبوی سیاست: ناموافق حالات میں اپنا ممکنہ کردار ادا کریں

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کے خلاف فوجی آپریشن میں ایک بڑی رکاوٹ فرعونی کابینہ کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی "رجل مؤمن" کی جرأت و بے پنا بصیرت کا حامل وہ کردار تھا، جس نے کئی مواقع پر ایمانی جرأت و بصیرت سے کھل کر کابینہ کی خفیہ میٹنگ میں فرعون کو براہ راست مخاطب کیا اور اسے موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فوجی آپریشن سے روکا، بالکل آخری موقع پر رجل مؤمن کا ایک طویل مکالمہ جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے اس کا بڑا فائدہ یہی ہوا کہ فوجی آپریشن کے حوالے سے اتفاق رائے ختم ہو گیا اور ایسے حساس مواقع پر جب اتفاق رائے متزلزل ہو جائے تو ماہرین سیاسیات جانتے ہیں کہ یہ کسی گروہ کے لیے کھلی شکست سے زیادہ خطرناک صورتحال ہوتی ہے۔ اس کردار سے معلوم ہوا کہ داعی کو زمان و مکان کے مقتضایات پیش نظر رکھ ہر سطح پر تیاری رکھنی چاہیے اور جو جس شعبے اور منصب پر ہو ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر اسے وہاں حق کے پرچار کے لیے کردار ادا کرنا چاہیے۔

ہماری دعوتی و سیاسی تحریکوں کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ مملکت کے عالی شعبوں تک "رجل مؤمن" کی رسائی کے لیے کوئی حکمت عملی نہیں رکھتے، بلکہ المیہ یہ ہے کہ اسے شجر ممنوعہ

سمجھتے ہیں اور اپنے ہی ملک میں، اپنے وسائل اور میدان ایسے لوگوں کے لیے کھلا چھوڑ دیتے ہیں جو طاغوتی طاقتوں کی سہولت کاری کر کے معاشرے سے دینی اقدار کی جڑیں کاٹنے میں سرگرم عمل رہیں۔ دوسری طرف اگر کلیدی مناصب تک رسائی ہو بھی جائے تو افراد کی ایسی مؤمنانہ تربیت نہیں کر پاتے کہ ان مناصب اور حالات کے جبر کی پروا کیے بغیر وہ حق کی حمایت کر سکیں۔ ایک بندہ مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ ہمہ وقت حالات کا گلہ کرنے کی بجائے، ان حالات میں پوشیدہ اپنے کردار کا ادراک کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری ادا کرے اور یہی قرآن کا تقاضا ہے اور عبد کا حقیقی مفہوم بھی!

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

اب "رجل مؤمن" کے کردار کو دیکھیں! زمان و مکان کے مقتضایات نے سماج کی سطح پر انہیں فرعون کے ایک مشیر خاص کے عہدے پر فائز کر رکھا تھا لیکن حقیقتاً وہ حضرت موسی علیہ السلام کے مخلص دوست تھے اور اپنے ایمان کو اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے۔ جب فرعون تمام معجزات دیکھنے کے بعد بھی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا اور جادوگروں کو شہید کر کے مشیروں کی ایک خاص مجلس میں حضرت موسی علیہ السلام کے قتل کا پختہ عزم کر لیا اور اپنی کابینہ کے سامنے فوجی آپریشن کا اظہار بھی کر دیا تو رجلِ مؤمن نے بھرے دربار میں اپنی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے بڑی دانش مندی سے اور نپے تلے انداز میں حضرت موسی علیہ السلام کے حق میں تقریر کی۔ اس نازک موقع پر انہوں نے بڑی وضاحت سے اپنا مؤقف فرعون کے سامنے رکھتے ہوئے اسے سرنڈر کرنے کی تلقین کی۔ ایک بپھرے ہوئے مطلق العنان حاکم اور کابینہ کے سامنے اس رجل مؤمن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بالواسطہ وکالت کا فریضہ انجام دیا اور انہیں اہل حق کی مخالفت کی پاداش میں سخت ترین عواقب و نتائج سے ڈرایا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق و باطل کے فیصلہ کن معرکہ میں ایسے جانثاروں کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنی فہم و فراست سے دشمن کی توجہ حق کے بڑے اہداف سے ہٹا کر چھوٹے اہداف کی

طرف مبذول کروا سکیں، تاکہ چھوٹا نقصان گوارا کر کے بڑے نقصان سے حفاظت ہو۔ رجل مؤمن نے موسیٰ علیہ السلام کے دفاع میں اپنے ایمان کی شہادت دے کر فرعونی کابینہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا دی۔ اسباب کے درجے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فرعون کے فوجی آپریشن کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکنے کے باوجود رجل مؤمن نے کابینہ کو مصروف کر کے اتنا وقت ضرور لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بامر الٰہی راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر محفوظ طریقے سے علاقہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

اپنی ذاتی مفاد کی پروا کیے اپنا عہدہ، منصب، جان حق پر وار دینے والوں کو خداوند کریم آزمائشوں کی بھٹی سے ضرور گزارتا ہے لیکن انہیں کفر کے ہاتھوں رسوا ہونے نہیں دیتا، قرآن مجید کی شہادت کے مطابق رجل مؤمن کی عظیم قربانی کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے فرعون کی دسترس سے محفوظ رہا، کیسے بچ نکلنے میں کامیاب ہوا؟ اس کی تفصیلات مہیا نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والوں کی حفاظت ہمیشہ ہی معجزاتی طور پر ہوتی رہی ہے، بات صرف خداوند قدوس پر بھرپور توکل، یقین اور بھروسے کی ہے۔

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَكْتُمُ اِیْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَیْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۔ یٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ظٰهِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ یَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِیْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰی وَ مَاۤ اَهْدِیْكُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ ۔ وَ قَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ ۙ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۔ وَ یٰقَوْمِ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ یَوْمَ التَّنَادِ ۙ ۔

(غافر:۲۸تا۳۲)

ترجمہ:اور ایک مؤمن شخص نے، جو فرعون کے خاندان میں سے تھا اور اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، کہا کہ کیا تم ایک شخص کو محض اس بات پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ تعالیٰ

ہے اور تمہارے رب کی طرف سے دلیلیں لے کر آیا ہے، اگر وہ جھوٹا ہو تو اس کا جھوٹ اسی پر ہے اور اگر وہ سچا ہو، تو جس (عذاب) کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تم پر آ پڑے گا، اللہ تعالیٰ اس کی رہبری نہیں کرتا جو حد سے گزر جانے والے اور جھوٹے ہیں۔ اے میری قوم! آج تو تمہاری حکومت ہے، تم زمیں پر غالب ہو لیکن اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو پھر ہماری مدد کون کرے گا؟ فرعون نے کہا: میں تو تمہیں وہی سوجھاتا ہوں جو مجھے سوجھی ہے اور میں تمہیں سیدھا ہی رستہ بتاتا ہوں۔ اور رجل مؤمن نے کہا کہ اے میری قوم! مجھے تو تمہاری نسبت (پہلی) امتوں جیسے دن کا اندیزہ ہو رہا ہے، جیسا کہ قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان سے پچھلوں کا حال ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ تو بندوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرنا چاہتا اور اے میری قوم! مجھے تم پر چیخ وپکار (قیامت) کے دن کا اندیشہ ہے۔ "

نبوی سیاست میں راز کی اہمیت

رجل مؤمن کے کردار سے دینی تحریکوں میں حساس شخصیات کے لیے راز کی اہمیت بھی سمجھ میں آتی ہے، یقیناً راز مؤمنانہ فراست کا مظہر اور ایٹم بم سے بھاری ہتھیار ہے۔ "کتمان ایمان" کا راز ہی ایسا تھا جس نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی کابینہ کے جملہ فیصلوں سے آگاہ کیے رکھا اور رجل مؤمن کی صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک متحرک کارکن پوری طرح سرگرم عمل رہے۔ اگر رجل مؤمن کی شخصیت فرعون سے راز میں نہ رہتی تو اتنا مؤثر اور جرأت مند کردار کبھی تخلیق نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی ذات کے بارے میں ہر بات ہر جگہ ظاہر کرنے کی نہیں ہوتی، رازداعی کے مؤثر کردار کا ضامن ہے۔

نبوی سیاست کا اصل ہتھیار: دعا و توجہ الی اللہ

دربار فرعونی میں جانے سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو بلیغ دعا مانگی:

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ۔ وَ یَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ۔ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ۔ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ۔ هٰرُوْنَ اَخِیْ۔ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ۔ وَ اَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ۔ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا۔ وَّ نَذْكُرَكَ

كَثِيْرًا۔اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا۔(طٰہٰ:۲۵تا۳۵)

ترجمہ: کہا: اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے اور میرا کام آسان کر اور میری زبان سے گرہ کھول دے کہ میری بات سمجھ لیں اور میرے لیے میرے کنبہ میں سے معاون بنادے، ہارون کو جو میرا بھائی ہے، اس سے میری کمر مضبوط کر اور اسے میرے کام میں شریک کر دے، تاکہ ہم تیرے ذات کی پاکی بہت بیان کریں اور تجھے بہت یاد کریں۔ بے شک تو ہمیں خوب دیکھتا ہے۔

اس دعامیں دینی تحریکوں ،اداروں اور اجتماعی نوعیت کے کام کرنے والوں کے لیے بڑے اسباق ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کا سہارا لیا۔ مؤمن کا سب سے بڑا ہتھیار! اسباب و وسائل جس قدر بھی ہوں وہ اپنی تاثیر میں اللہ تعالیٰ کے امر کے محتاج ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنا چاہیے اور ہمہ وقت اسی ذات پر نظر رہنی چاہیے۔

نبوی سیاست میں شرح صدر کی اہمیت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شرح صدر کی دولت مانگی :رب اشرح لی صدری۔ شرح صدر اپنے مؤقف کی حقانیت پر اس درجہ یقین کو کہتے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا مفاد، لاؤلشکر، مال و دولت، قوت و طاقت آپ کو اپنے مؤقف سے پھیرنے کے لیے مقابلہ پر آجائے تو لمحہ بھر کے لیے بھی قدم میں جنبش پیدا نہ ہو۔ اگر انسان اپنے مؤقف کے بارے میں اس درجہ یقین یا شرح صدر سے محروم ہو تو اس کی دعوت پہلے تو نتیجہ خیز نہیں ہوتی اگر کچھ نتائج نکلیں بھی تو وہ دیرپا نہیں ہوتے، اس لیے جس بات کی دعوت دی جارہی ہے اس کی حقانیت پر خود ایسا شرح صدر نصیب ہو تو اس کے لیے ہر قربانی آسان ہو جاتی ہے، ورنہ تردد و تذبذب میں آئے دن مؤقف بدلتے رہتے ہیں، واضح ہدف پیش نظر نہیں رہتا، یہاں تک کہ جس نظریے کی طرف لوگوں کو بلایا جارہا ہوتا ہے، زمان و مکان کے جبر میں داعی کے روز بروز رنگ بدلنے سے وہ خود تماشا بن جاتا ہے۔

نبوی سیاست میں وسائل مہیا کرنے کی اہمیت

دوسرے مرحلے پر تیسیر امر کا سوال کیا : ویسر لی امری۔ دنیا دارالاسباب ہے، یہاں ہر کاوش مادی اسباب کے ساتھ جڑی ہے ،اپنی دعوت کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے جس قدر آسانی اور سہولت شرعی دائرے میں مہیا ہو سکتی ہو اسے اختیار کرنا دعوت کی افادیت و وسعت کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ آپ کے اسباب و وسائل جس قدر مضبوط ہوں گے اسی قدر کام میں یکسوئی پیدا ہو گی۔ داعی کی نظر درحقیقت مسبب حقیقی پر ہوتی ہے لیکن وہ خالق اسباب کے پیدا کردہ اسباب سے غفلت و تساہل نہیں برتتا، جن دعوتی تحریکوں میں اس پہلو سے کوتاہی ہو، وہاں توکل کے نام پر تعطل پروان چڑھتا ہے اور وسائل واسباب کی بہترین منصوبہ بندی نہ ہونے باعث کئی رکاوٹیں جنم لیتی ہیں اور کام میں آسانی بہم پہنچانے کی بجائے مشکلات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، جس کا براہ راست اثر دعوت پر پڑتا ہے اور دعوت کمزور یا محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

دعوت وسیاست میں قوت تفہیم اور مؤثر لٹریچر کی اہمیت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیسرے مرحلے پر زبان کا عقدہ کھولنے کی درخواست کی، اسی طرح ایک موقع پر حضرت ہارون علیہ السلام کی فصاحت لسانی کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ ان کی شرکت کاری طلب کی۔واحلل عقدة من لسانی یفقھوا قولی۔ آپ جس چیز کو لے کر چل رہے ہیں اگر اس کی درست تفہیم اور اس کے بارے میں پیدا ہونے والی علمی و فکری الجھنوں کو سلجھانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو آپ اپنی دعوت کو وسعت نہیں دے سکیں گے، نہ ہی فطین طبقے کو قائل کر سکیں گے۔ داعی کے لیے زبان و قلم کی قوتوں، عصری اسالیب بیان اور اپنی دعوتِ فکر کا مدلل و مؤثر لٹریچر مہیا کرنا ضروری ہے۔ اگر آپ کا مخاطب زمین پر ہے اور آپ خلا میں بول رہے ہیں تو یفقھوا قولی۔ کا مقتضا پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جس قوم کے پاس پیغمبر بھیجا ان کی مادری زبان میں بھیجا تاکہ انہیں بات سمجھنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ آج کل دعوت دین سے وابستہ طبقات کو سوچنا چاہیے کہ ان کا عقدہ لسان کس درجے میں دین کی تفہیم سے مانع ہے۔ معاشرے کی زبان اور محاورات

بدل چکے ہیں اور ہماری دعوت ابھی تک انہی گاڑھی اصطلاحات میں ڈھکی ہوئی ہے، اپنی دعوتی زبان و بیان میں اتنی جامعیت و تسہیل ناگزیر ہے جس سے مخاطب آپ کے مدعا کو پوری طرح سمجھ لے۔

دعوتی وسیاسی تحریکوں میں مخلص وجانثار کارکنوں وجانشینوں کی اہمیت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے حضرت ہارون علیہ السلام کا ساتھ مانگا۔ کیونکہ تحریکیں اور ادارے مخلص معاونین کے بغیر نہیں چلتے۔ پھر بھائی کا ساتھ مانگا کیونکہ قیادت کو جاں گسل تحریکوں میں محض نظریاتی تعلق کے معاونین ہی نہیں نسبی تعلق داروں کی ضرورت ہوتی ہے بعض اوقات اتنے سخت حالات آتے ہیں کہ نسبی رشتہ اور حمیت ہی انسان کو کھڑا رکھتی ہے۔ جیسا کہ بیعت عقبہ کی خفیہ میٹنگ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ باوجود اس وقت غیر مسلم ہونے کے شریک رہے اور ایک درجہ میں مذاکرات انہوں نے ہی طے کیے کیونکہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی تعلق حاصل تھا۔

حضرت ہارون حضرت موسیٰ علیہما السلام کے شریک کار بنائے گئے۔ قیادت کو سارے کام اپنے ہی قبضہ میں نہیں رکھنے چاہئیں بلکہ دوسروں کو شریک کار بنانا چاہیے تاکہ جانشین تیار ہوں۔

حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون علیہما السلام کی شرکت طلب کرنے کا ایک مقصد خود ہی ذکر کیا کہ ہم اکٹھے اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور ذکر کر سکیں۔ یقیناً ذکر و تسبیح اور یاد خداوندی میں ماحول بنانے کی تاثیر انفرادیت سے بڑھ کر ہے، عبادت اور ذکر کے ماحول اور اجتماعیت میں ذکر و تسبیح میں آسانی رہتی ہے۔

دشمن کی معاشی طاقت: حق کے فروغ میں رکاوٹ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰی اَمْوَالِهِمْ (یونس:۸۸)[اے ہمارے پروردگار! ان کے مال و دولت کو تہس نہس کر دے۔] فرما کر فرعونی معیشت کی تباہی مانگی، ہر عہد کا طاغوت اپنی معاشی طاقت کی بنیاد پر حق کے ساتھ مقابلہ آراء ہوتا ہے۔ طاغوت کے خلاف سیاسی جدوجہد کی کامیابی کا پہلا زینہ ہی یہی ہے کہ اس کی معیشت پر کاری ضرب لگائی جائے، اگر دشمن کی معیشت مضبوط ہو تو

اس کے پاس حق کا راستہ روکنے کے بے شمار وسائل ہوتے ہیں، حق کے کامل غلبہ کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ طاغوت کی معاشی قوت کمزور ہو۔ اہل حق معاشی قوت تکبر و تجبر کے لیے نہیں بلکہ باطل کا مقابلہ کرنے اور زندگی کی ضروریات سے عہدہ برا ہونے کے لیے استعمال کرتے ہیں جبکہ باطل معاشی قوت کا حصول دنیا کو جنت بنانے، انسانیت کو خدا سے غافل کر کے اس کی بغاوت پر آمادہ کرنے اور اہل حق کی قوت کمزور کرنے کے استعمال کرتے ہیں۔

داعی کا اصل مطمح نظر

داعی کی نظر ہمیشہ اہداف پر رہتی ہے، وہ کبھی خواہش نفس یا آرام طلبی و آسائش کی طرف مائل نہیں ہوتا، دنیا میں وہی لوگ غالب رہتے ہیں جو خواہشات کی بجائے اہداف کو پیش نظر رکھیں۔ فرعونی لشکر جب بحر قلزم کا لقمہ بن گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے یہ نہیں کہا کہ آئیں! فرعونی محلات خالی ہو چکے ہیں، نظم حکومت کے عہدے اور دفاتر خالی پڑے ہیں، ان محلات میں آسائش سے رہیں گے، عہدوں اور مناصب کے مزے لوٹیں گے اور ایک طویل عرصہ کی قربانیوں کا مادی ثمرہ کھائیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی محلات کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا، بلکہ قوم عمالقہ کو اپنے آباواجداد کی سرزمین سے بذریعہ جہاد نکالنے کا جو ہدف سپرد ہوا، فوراً اس کے حصول کی طرف چل پڑے۔ داعیوں کی راہ میں مادیت کے بڑے میٹھے دریا آتے ہیں، اگر وہ تھک ہار کر یا خواہش نفس کی پیروی کر کے ان سے منہ لگا بیٹھیں تو اونچے اہداف سے رہ جاتے ہیں۔ داعی کی نظر تحریکِ دعوت کے مادی ثمرات پر نہیں رہنی چاہیے، بلکہ داعی کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی تو جہدِ مسلسل، فقر و زہد اور مال و منصب سے بے نیازی ہونی چاہیے، اسی راہ و طریق پر چل کر اہداف تک رسائی ممکن بنتی ہے۔

صالح قیادت کے باوجود اہداف تک رسائی کب ناممکن ہوتی ہے؟

صالح قیادت کے باوجود اہداف تک رسائی اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک جماعت میں صبر و ثبات، نظم و ضبط، تقویٰ و للّٰہیت اور دین پر مر مٹنے کے جذبات کامل طریقے سے پیدا نہ کیے

جائیں۔ بنی اسرائیل ایک طویل عرصہ مصریوں کے غلام رہے، انہوں نے قدم قدم پر خدائی تصرف اور معجزات کا مشاہدہ کیا، انہوں نے اپنی آنکھوں سے فرعون کولاؤلشکر سمیت بحر قلزم کا لقمہ بنتے دیکھا، لیکن ان تمام خوارق کے مشاہدے کے باوجود غلام کے وہ گہرے اثرات ان کی طبیعتوں سے زائل نہ ہو سکے۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

> غلامی اور محکومانہ کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمت و عزم کی روح پست ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان اس ناپاک زندگی کی ذلت آمیز امن وسکون کو نعمت سمجھنے اور حقیر راحتوں کو سب سے بڑھیا عظمت تصور کرنے لگتا ہے اور جدوجہد کی زندگی سے پریشان و حیران نظر آتا ہے، اس کی زندہ شہادت ان بنی اسرائیل کی زندگی کا وہ نقشہ ہے، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آیات بینات دکھانے، عزم و ہمت کی تلقین کرنے اور خدا کے وعدہ کامرانی کو باور کرانے کے باوجود ان میں زندگی اور پامردی کے آثار نظر نہیں آتے اور وہ قدم قدم پر شکووں اور حیرانیوں کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ارض مقدس میں داخلہ اور وعدہ نصرت کے باوجود بت پرست دشمنوں کے مقابلے سے انکار کے وقت جو یہ تاریخی جملے انہوں نے کہے وہ اس حقیقت کے لیے شاہد عدل ہیں: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔(مائدۃ:۲۴)[ترجمہ: اے موسیٰ! تو اور تیرا رب دونوں جا کر لڑو بلاشبہ ہم تو یہی بیٹھے ہیں۔(یعنی تماشہ دیکھتے ہیں)۔](قصص القرآن، ج:۱، ص:۵۶۷)

قوموں کا یہ ذلت آمیز مزاج خدائی نشانیاں دیکھنے سے بھی نہیں بدلتا، وہ مادی پیمانوں پر ہی سوچتے ہیں اور اگر کوئی قوت ان سے زور وطاقت میں بڑھی ہوئی ہو تو وہ قطعا اس کے مقابلے پر آمادہ نہیں ہوتے، وہ اسے ناقابل تسخیر سمجھتے ہیں، جیسا کہ بنی اسرائیل نے قوم جبارین کو ناقابل تسخیر تصور کیا اور ان کے مقابلہ سے پہلو تہی کی۔ اس بزدلانہ امن پر قناعت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان قوموں کو آزادی وخود مختاری کی نعمت سے محروم کر کے صرف کھانے پینے اور تن آسانی کے عذاب میں مبتلا کر

دیا جاتا ہے، وہ مشقت کی کاموں سے جی چراتے ہیں اور تیار خوری کے مریض بن کر دوسروں کے دست نگر بن جاتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی اس نسل کو بھی وادی تیہ میں مقید کر کے اس جرم کی سزا دی گئی، انہیں تورات مل چکی تھی، لیکن وہ اس پر عمل میں حیل وحجت سے کام لیتے رہے، یہاں تک کہ ان کی یہ نسل ختم ہوئی، نئی نسل سامنے آئی اور اس نے حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں جہاد کر کے ارض مقدس کو واپس لیا۔

کامیابی کے بعد سرکشی کی سزا بڑی سخت ہوتی ہے

آزادی کی نعمت بڑی عظیم ہے، جب کسی قوم کی سیاسی جدوجہد کامیاب ہو اور اسے ظالم وجابر قوم سے نجات مل جائے تو اس پر شکر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حق کے نفاذ میں کوتاہی نہ کریں اور ہر موقع پر خدا کے سامنے سر نیاز جھکائے رکھے، اگر خدانخواستہ وہ خدائی وعدوں سے منحرف ہو جائے تو اسے بدترین زندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں بھی خدا نے آزادی کی نعمت سے نوازا، لیکن کیا ہم اس کی قدردانی کر سکے، یا جس نظریہ پر طویل قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا تھا اسی سے غداری کے مرتکب ٹھہرے، یاد رکھیں! اس کی سزا دائمی ذلت ہے الا یہ کہ اس کوتاہی سے سچی توبہ کر لی جائے۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

> یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ انسان کو جب حق کی بدولت کامرانی وکامیابی حاصل ہو جائے تو خدا کے شکر وسپاس اور عبودیت ونیاز کی جگہ مخالفین حق کی طرح غفلت اور سرکشی میں مبتلا ہو جائے، افسوس کہ بنی اسرائیل کی داستان کا وہ حصہ جو فرعون سے نجات پاکر قلزم عبور کرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے اس گمراہی سے معمور ہے۔ (قصص القرآن، ج:۱، ص:۵۶۸)

اس مختصر سے تجزیہ میں دعوتی تحریکوں، دینی اداروں اور غیر مسلموں کے جبر میں اپنی آزادی کے لیے کوشاں مسلمانوں کے واسطے دعوت واصلاح، منطق ودلیل، عزیمت، جرأت، بصیرت، صبر و

استقامت، جہد مسلسل، نصرت خداوندی کے نمونوں، منہ زور جبر و ظلم کے استیصال اور حکمت نبوی کے گراں قدر موتی پوشیدہ ہیں۔ هذاماعندی والعلم عندالله

سیاسی بحران اور ان سے نکلنے کا قرآنی دستور
حضرت طالوت کی تحریک کی روشنی میں

قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے ایک عہد زوال اور اس زوال سے عروج کے سفر کی عجیب کار گزاری مذکور ہے، اس میں زوال پذیر قوموں کے لیے بحرانوں سے نمٹنے، سیاسی استقلال اور بالا دستی و بالاتری حاصل کرنے اور ناقابل تسخیر سمجھے جانے والے دشمنوں کو زیر کرنے کے حوالے سے انتہائی مفید رہنمائی ہے۔ ذیل میں واقعہ سے متعلق مکمل آیات ذکر کر کے ان سے حاصل ہونے والے نکات و معارف کا ذکر کریں گے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ۔ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۔فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ۔ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۔(سورۃ البقرہ، آیات:۲۴۶تا۲۵۲)

ترجمہ: بھلا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا جس نے موسیٰ کے بعد اپنے پیغمبر سے کہا کہ آپ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیں تا کہ ہم خدا کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر نے کہا کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو عجب نہیں کہ لڑنے سے پہلو تہی کرو۔ وہ کہنے لگے کہ ہم راہ خدا میں کیوں نہ لڑیں گے جب کہ ہم وطن سے (خارج) اور بال بچوں سے جدا کر دیئے گئے۔ لیکن جب ان کو جہاد کا حکم دیا گیا تو چند اشخاص کے سوا سب پھر گئے اور خدا ظالموں سے خوب واقف ہے۔ اور پیغمبر نے ان سے (یہ بھی) کہا کہ خدا نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔ وہ بولے کہ اسے ہم پر بادشاہی کا حق کیوں کر ہو سکتا ہے بادشاہی کے مستحق تو ہم ہیں اور اس کے پاس تو بہت سی دولت بھی نہیں۔ پیغمبر نے کہا کہ خدا نے اس کو تم پر فضیلت دی ہے اور (بادشاہی کے لئے) منتخب فرمایا ہے اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی (بڑا عطا کیا ہے) اور خدا (کو اختیار ہے) جسے چاہے بادشاہی بخشے۔ وہ بڑا کشائش والا اور دانا ہے۔ اور پیغمبر نے ان سے کہا کہ ان کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسلی (بخشنے والی چیز) ہو گی اور کچھ اور چیزیں بھی ہوں گی جو موسیٰ اور ہارون چھوڑ گئے تھے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لئے ایک بڑی نشانی ہے۔ غرض جب طالوت فوجیں لے کر روانہ ہوا تو اس نے (ان سے) کہا کہ خدا ایک نہر سے تمہاری آزمائش کرنے والا ہے۔ جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا (اس کی نسبت تصور کیا جائے گا کہ) وہ میرا نہیں۔ اور جو نہ پیئے گا وہ (سمجھا جائے گا کہ) میرا ہے۔ ہاں اگر کوئی ہاتھ سے چلو بھر پانی پی لے (تو خیر۔ جب وہ لوگ نہر پر

پہنچے) تو چند شخصوں کے سوا سب نے پانی پی لیا۔ پھر جب طالوت اور مومن لوگ جو اس کے ساتھ تھے نہر کے پار ہو گئے۔ تو کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ جو لوگ یقین رکھتے تھے کہ ان کو خدا کے روبرو حاضر ہونا ہے وہ کہنے لگے کہ بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے اور خدا استقلال رکھنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل آئے تو (خدا سے) دعا کی کہ اے پروردگار ہم پر صبر کے دہانے کھول دے اور ہمیں (لڑائی میں) ثابت قدم رکھ اور (لشکر) کفار پر فتحیاب کر۔ تو طالوت کی فوج نے خدا کے حکم سے ان کو ہزیمت دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر ڈالا اور خدا نے اس کو بادشاہی اور دانائی بخشی اور جو کچھ چاہا سکھایا اور خدا لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے) سے ہٹاتا نہ رہتا تو ملک تباہ ہو جاتا لیکن خدا اہل عالم پر بڑا مہربان ہے۔ یہ خدا کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو سچائی کے ساتھ پڑھ کر سناتے ہیں (اور اے محمد ﷺ) تم بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہو۔

حضرت یوشع علیہ السلام کی قائم کردہ حکومت اور اس کا زوال

حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل نے عمالقہ سے جہاد کر کے فلسطین کا ایک بڑا حصہ فتح کیا، اس حصے پر حضرت یوشع علیہ السلام نے جو نظم حکومت تشکیل دیا اس میں ہر قبیلے اور علاقے کا ایک قاضی مقرر کیا جو ان کے جملہ امور کا نگران ہوتا تھا اور حضرت یوشع علیہ السلام ان سب کی نگرانی فرماتے تھے۔ حضرت یوشع علیہ السلام کے انتقال کے بعد یہ نظم حکومت اسی ڈھانچے کے مطابق ساڑھے تین سو سال چلتا رہا، اس عہد کو قاضیوں کا دور کہا جاتا ہے، چونکہ ان تمام قبائل کا کوئی متفقہ حکمران نہیں تھا اس لیے یہ اردگرد کی اقوام کے حملوں کی زد میں رہتے تھے، کیونکہ منتشر اکثریت جب ان میں قومی و ملی وحدت نہ ہو ہمیشہ منظم اقلیت کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ ان بنی اسرائیلیوں کے ساتھ بھی یہی ہوا، فلسطین کی ایک بت پرست اشدودی قوم ان پر حملہ آور ہوئی ان کے قبائل کو تہس نہس کر دیا، ان کے تجارتی مراکز کو لوٹ لیا ان کی عورتوں بچوں کو قیدی بنا لیا یہاں

تک کہ ان کے تبرکات کا صندوق جس کے توسل سے وہ دعائیں مانگتے تھے اور جنگوں میں صف اول میں رکھتے تھے، بھی اشدودیوں نے چھین لیا، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصا مبارک، حضرت ہارون کا عمامہ، تورات کا نسخہ، کچھ یادگاریں اور آسمانی غذا 'من' کا مرتبان تھا۔ بنی اسرائیل کا بیشتر علاقہ اشدودیوں کے تسلط میں آگیا، یہ لوگ اپنے آباد علاقوں اور گھروں سے دور مہاجر کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہوگئے۔ ان سنگین حالات میں بنی اسرائیل کے قاضیوں میں سے ایک قاضی حضرت شموئیل علیہ السلام کو منصب نبوت عطا کیا گیا، قوم نے ان سے خواہش کا اظہار کیا کہ ان منتشر قبائل کا کوئی منظم نظم حکومت اور متفقہ حکمران ہونا چاہیے تاکہ سارے قبائل ان کے ساتھ مل کر ان دگرگوں حالات سے نکلنے کی تدبیر کریں اور دشمن نے جو علاقے چھین لیے ہیں اور بچوں تک کو قید کر کے لے گئے ہیں ان کی آزادی کے لیے قتال کریں۔

قوموں میں وحدت پیدا کرنے کے اسباب

سیاسیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ جس طرح عقیدہ و نظریہ انسان کو ایک مقصد پر جمع کر دیتا ہے اور لڑنے بھڑنے پر آمادہ کر دیتا ہے اس طرح نسلی و وطنی رشتے بھی ایسی ہی تحریک پیدا کرتے ہیں جب وطن اور نسل پر آفت آئے تو انسان ان کے دفاع کے لیے کمربستہ ہو جاتا ہے۔ جان مال اولاد اور وطن کی حفاظت بھی مطلوب ہے اور ان کے دفاع کے لیے جہد و جہاد اہم ترین فرائض میں سے ہے۔

نظریاتی اور حادثاتی تحریکوں کا فرق

حضرت شموئیل علیہ السلام قوم کی نفسیات سے واقف تھے انہیں اندازہ تھا کہ وقتی حوادث سے پیدا شدہ جوش و خروش کی عمر عموماً بہت کم ہوتی ہے اور جب قربانی کا مرحلہ آتا ہے تو مفاد پرست عناصر یا کم ہمت لوگ اس کی سہار نہیں رکھتے جس کی وجہ سے مشکلات کم ہونے کی بجائے مزید بڑھ جاتی ہیں، اس لیے انہوں نے قومی وفد کو اپنے عزم پر نظر ثانی کے لیے متوجہ کیا۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

جب کسی قوم کے خواص اپنے استقلال اور دشمن کے مقابلہ میں حفاظت و دفاع کا شعور بہت زیادہ ترقی پاتا ہے تو وہ عوام اور خام کار افراد ملت و قوم کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا، اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارا یہ شعور اور یہ جذبہ قومی عصبیت و حمیت میں خواص کے شعور سے کسی طرح کم نہیں ہے، مگر جب یہ فکر ، شعور سے گزر کر عمل و ظہور کی وادی میں آتا ہے تو اس وقت ان پر اپنا عجز وخامکاری ظاہر ہو کر رہتی ہے اور صادقین کاملین کے علاوہ اس وادی پر خار کا کوئی دوسرا رہ نورد نظر نہیں آتا، چنانچہ یہی حقیقت ہے جس کو قرآن عزیز نے ان الفاظ یں بیان کیا ہے: فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ (پھر جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا سب پیٹھ دکھا گئے۔(قصص القرآن، ج:۲، ص:۵۴)

نبوی سیاسی فیصلوں کی اساس

انبیائے کرام علیہم السلام کے ایسے فیصلے جو اجتہادی ہوں وہ بھی ٹھوس حکمت عملی اور حقائق و حالات پر گہرے غور و فکر کے بعد وجود میں آتے ہیں، اس لیے انہیں مشورے کا حکم دیا جاتا ہے کہ مشورہ اجتماعی دانش کے غور و فکر کا عمل ہے، انفرادی سطح پر کسی فیصلے کا قطعاوہ مقام یا اہمیت نہیں ہو سکتی جو اجتماعی فیصلے کی ہوتی ہے۔ حضرت شموئیل علیہ السلام کے سامنے قوم نے اپنے عزم کو پھر سے مدلل پیش کیا اور اس عزم کی پشت پر جو محرکات تھے انہیں وضاحت سے بیان کیا، واقعی عقیدہ و نظریہ کے بعد اولاد، گھر اور وطن کی محبت ایسی چیز ہے کہ جو انسان کو عمل کی قوت اور اقدام کی زبردست تحریک بخشتی ہے۔

قومی تنظیم کے لیے طالوت کا انتخاب اور مادی سیاست دانوں کی تنقید

جب حضرت شموئیل علیہ السلام نے قومی تنظیم اور تحریک کے لیے حضرت طالوت کو ان کا سیاسی قائد چنا، جو بنی اسرائیل کے انبیاء کرام کا اختیار ہوا کرتا تھا تو معاشرے کا مالدار طبقہ اور سیاست دان

ایک بار پھر حضرت شموئیل علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور اس فیصلے پر اپنے تحفظات پیش کیے۔

مادی سیاست کا اصول: دعویٰ اہلیت

ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ طالوت کی نسبت اقتدار کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ معاشرے کا پرانا گھاگ سیاسی قوم کی رہنمائی کو اپنا تنہا حق سمجھتا ہے چاہے وہ کتنا ہی نااہل کیوں نہ ہو، اس کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ اہلیت تو میری ہی ہے، میرے علاوہ کوئی اہل شخص موجود ہی نہیں۔ یہ نفسیات انسان کو ذاتی خول میں بند کر دیتی ہے، ایسے شخص کی نظر حقیقی ملی و قومی مسائل کی بجائے ایسے کاموں پر ہوتی ہے جس میں نمائش کا پہلو زیادہ ہو کیونکہ نمائش ہی پر وہ اپنی ساکھ کی بقا موقوف سمجھتا ہے۔ اسے ہر دلعزیزی بھی مطلوب ہوتی ہے اس لیے وہ معاشرے کے اس طبقے کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالنا ضروری سمجھتا ہے، جہاں سے اسے زیادہ حمایت کی توقع ہو نتیجتاً ایسا لیڈر قومی و ملی مسائل کو تو کیا حل کرتا ہے قوم و ملت کے مفاد کے لیے خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ اسے محض اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے، نفسیاتی طور پر خود غرض شخص کبھی بھی بے لوث قربانی و ایثار پر آمادہ نہیں ہوتا جبکہ قومی و ملی مسائل بے غرضی، بے لوثی اور ایثار و قربانی کے بغیر حل ہو جائیں یہ ناممکن ہوتا ہے۔

مادی سیاست کا اصول: انتخاب کی بنیاد پیسہ

دوسری بات جو دراصل ان کے پہلے اعتراض کی دلیل ہے یہ پیش کی کہ طالوت کے پاس مالی وسعت نہیں، لہذا وہ اقتدار کا بھی اہل نہیں، گویا ان کا نظریہ یہ تھا کہ ملی و قومی قیادت کا اہل صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے مالی وجاہت و وسائل مہیا ہوں۔ ان کی نظر میں کثرت مال ہی اقتدار کا معیار تھا۔

نص کے مقابلے میں رائے زنی عملی کفر ہے

حضرت شموئیل علیہ السلام نے ان کے اس نظریے کو دو طریقوں سے مسترد کیا۔ پہلے تو یہ فرمایا کہ طالوت کا انتخاب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہوا ہے اور خدا کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے نہ کسی کو اسے چیلنج کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی اس کے مفید ہونے میں شک کر سکتا ہے۔ جس چیز کو خدا اپنے

بندوں کے لیے پسند کر دے اس سے بہتر چیز بندے کے حق میں کیا ہو سکتی ہے؟ خدا کا فیصلہ (جسے نص سے تعبیر کیا جاتا ہے) کے مقابلے میں رائے زنی یا نظر ثانی کا بندے کے پاس اختیار ہی نہیں ہوتا، بلکہ نص جس معاملے کو طے کر لے اس کے بارے میں از سر نو قانون سازی خدا کے اختیار کو چیلنج کرنے کے مترادف اور ایک طرح کا عملی کفر ہوتا ہے۔

نبوی سیاست میں اقتدار کی دو بنیادیں

حضرت شموئیل علیہ السلام نے دوسری بات یہ سمجھائی کہ آپ لوگ اس بدترین مغالطے کا شکار ہیں کہ اقتدار کا مدار مالی وسعت پر ہے اور انتخاب میں مالی وسائل کو دیکھ کر فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ اقتدار کا مدار صرف دو چیزوں پر ہے ایک علم پر کہ امور سلطنت کے نظم وانصرام کے لیے جن علوم اور جس فہم و بصیرت کی ضرورت ہے وہ مہیا ہو، دوسرا قومی و ملی مسائل کے حل کے لیے جو جسمانی استعداد، اعصابی مضبوطی اور معنوی و قلبی قوت درکار ہوتی ہے وہ موجود ہو۔ اگر انسان امور سلطنت کا علم ہی نہیں رکھتا یا علم تو رکھتا ہے لیکن اس کی جسمانی و قلبی قوت کمزور ہے اور وہ سنگین حالات میں پامردی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا، دشمن کی طاقت سے مرعوب ہو جاتا ہے اور جرات وبسالت کی موت پر بزدلی کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے تو نرا علم بھی کسی کام کا نہیں، قوم کو مسائل و مشکلات کے گرداب سے نکالنے کے لیے جس ناخدا کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان دو صلاحیتوں سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ رہی مال و دولت کی فراوانی تو وہ نہ علم وہنر کا بدل بن سکتی ہے نہ جسمانی و قلبی اہلیت کی کمی پوری کر سکتی ہے۔ کمال علم اور کمال جسم کے ساتھ یہ معرکہ بغیر مال کے بھی طے ہو سکتا ہے لیکن اگر یہ معنوی و جسمانی خوبیوں سے قیادت عاری ہو تو محض مال کے خزانے قوموں کو آزادی و حریت اور خود مختاری کے راستے پر نہیں ڈال سکتے۔ سو معلوم ہوا کہ قوموں کو بحرانوں سے نکالنے کے لیے محض علمی قابلیت یا محض شجاعت و بہادری کافی نہیں، یہ دونوں چیزیں یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک لیڈر علمی و فنی کمالات سے بہرہ ور ہو لیکن اس کے پاس دشمن سے مقاومت کے لیے درکار قلبی و اعصابی اور جسمانی قوت و طاقت نہ ہو یا جسمانی طاقت اور فوج ظفر موج تو موجود ہو لیکن ایثار و قربانی کی سپرٹ اور کٹ مرنے کا

جذبہ مفقود ہو تو ایسا لیڈر کبھی بھی قوموں کی ناؤ منجدھار سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہی حال اندھی طاقت و قوت اور شجاعت و بہادری کا ہے، اگر اس کے ساتھ علم و فہم کی دولت نہ ہو تو ایسی شجاعت تہوُّر میں بدل کر قوموں کے مسائل میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

عہد جدید کی سیاسی نفسیات بنی اسرائیلی نفسیات ہے

اس عہد کی سیاسی نفسیات بنی اسرائیلی نفسیات ہے، قومی و ملی مسائل کے حل کے لیے باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں تھمائی جاتی ہے وہ علم و فہم اور قوت و شوکت کے مطلوبہ معیار سے فروتر ہوتے ہیں، ان کے پاس محض مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے، وہ مال لٹاتے ہیں اور اس کے بل بوتے پر مناصب خریدتے ہیں۔ مالی وسائل کے ذریعے اس واسطے منصب حاصل کرنا کہ شوکت و وجاہت حاصل ہو، ایک قبیح حرکت ہے اور غلام قوموں کا شعار ہے لیکن اس سے بڑھ کر بے حمیتی اور تباہی یہ ہوتی ہے کہ منصب کے لیے پیسہ اس لیے لٹایا جائے کہ منصب پر پہنچ کر اس سے دگنا لوٹا جا سکے، ایسی سیاسی قیادت رکھنے والے کے زوال و ادبار کا بار کسی بیرونی دشمن پر ڈالنا قرین انصاف نہیں ہوتا، یہ قوم اپنی دشمن خود ہوتی ہے، یہ ملی خودکشی ہے کہ محض عارضی مالی مفادات کے لیے قومی و ملی باگ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دے دی جائے جن کا مقصد وحید اپنے خزانوں کا پیٹ بھرنا ہو، اس قوم کو کسی دشمن کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ اپنی تباہی کا گڑھا خود اپنے ہاتھ سے کھودتی ہے۔

اس لیے حضرت شموئیل علیہ السلام نے محض مالی وجاہت کی بنیاد پر قوم کی سیاسی باگ ڈور سنبھالنے والوں کو مسترد کر دیا اور ملی قیادت ایسی شخصیت کے حوالے کر دی جو قوم کو بحرانوں سے نکالنے کے لیے مطلوبہ علم و فہم سے بہرہ ور اور مضبوط دشمن کا سامنا کرنے کی پوری جسمانی و اعصابی طاقت رکھتا تھا۔ حضرت شموئیل علیہ السلام کی اس گفتگو نے قوم کے مالدار سیاسی طبقے کی ترجیحات تبدیل کر دیں۔ واقعی انبیاء کرامؑ کی پُر اثر اور منطقی گفتگو کا کسی کے پاس جواب نہیں ہوتا اور سلیم الطبع شخص کو اس کا اقرار کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

اتفاق واتحاد کی مادی برکات

حضرت طالوت کی قیادت پر اتفاق سے خداوند قدوس کی رحمت متوجہ ہونے لگی اور وہ تبرکات کا صندوق جو اشدودی اٹھا کر لے گئے تھے، فرشتے واپس لے آئے، اتفاق واتحا، وحدت کلمہ، وحدت فکر یہ قوموں کے وہ ہتھیار ہوتے ہیں جن کی بدولت جہاں خداوند قدوس مادی فتوحات اور کامرانیوں کے در وا کر دیتے ہیں وہاں معنوی و روحانی برکات اور نصرتوں کے خارق عادت دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔

قوم عملی نتائج دیکھ کر جلد مطمئن ہوتی ہے

انسانی نفسیات یہ ہے کہ یہ حسی نتائج دیکھ کر جلد مطمئن ہو جاتا ہے، ایک تو وہ لمحہ تھا کہ حضرت طالوت کی قیادت پر اعتراضات اٹھ رہے تھے، قوموں کے پاس ہدف نہ ہو، کام نہ ہو تو ان کی کاوشوں کا محور نظری مباحث اور اعتراضات واشکالات رہ جاتے ہیں، لیکن جیسے ہی حضرت طالوت کی قیادت کے موثر ہونے کی خداوندی نشانیوں کو ظہور شروع ہوا اور بنی اسرائیل نے یہ نتائج کھلی آنکھوں سے دیکھے تو حضرت طالوت کی قیادت پر شرح صدر بھی ہوا، باوجود مالی حیثیت کی فروتری کے قوم نے انہیں تسلیم کیا اور اس کی قیادت میں اکٹھی ہو گئی۔

قوموں کی جذباتی وابستگی مقدسات سے ہوتی ہے

قوموں کی جذباتی وابستگی مقدسات سے ہوتی ہے اور ان کی عقیدت کا تعلق عموماً ان شخصیات سے وابستہ ہو جاتا ہے جن کے ذریعے ان کے مقدسات کا تحفظ ہو، بنی اسرائیل کے لیے اپنے بزرگوں کے تبرکات کا صندوق ایک خاص تقدس رکھتا تھا اس کے وسیلے سے وہ دعائیں مانگتے تھے، اسے جنگوں میں آگے رکھتے تھے اور اسے اپنے غلبے اور فتح کا نشان سمجھتے تھے، اس مقدس صندوق کی واپسی نے ان کے غلبہ کی نفسیات کو مہمیز بخشا اور حضرت طالوت سے قلبی عقیدت پیدا کی جو قوموں میں وحدت اور اتفاق واتحاد کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔

مقدس صندوق کی واپسی کے معجزے کا نفسیاتی اثر

قیادت پر اعتماد کمزور ہو، اس سے عقیدت و محبت کا تعلق نہ ہو تو وحدت قائم نہیں رہ پاتی، فکری تشتت اور انتشار پیدا ہوتا ہے، اہداف پر ترکیز ختم ہو جاتی ہے، اپنا مفاد اور حیثیت خطرے میں دکھنے لگتے ہیں اور نتیجتاً اجتماعی نوعیت کے کاموں میں قومیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ آج کل کے علوم سیاسیات میں اسے "سیاسی عصبیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، معروف میں قیادت پر ایسا قوی اعتماد کہ اس کے مقابلے میں کسی مشاغبے کو اہمیت نہ دی جائے، اس کی بشری کمزوری (نہ کہ ایسی کمزوری جو اعلانیہ گناہ کبیرہ یا ملی و قومی نقصان کا باعث ہو) کو وسیع تر قومی مفاد میں نظر انداز کیا جائے، اپنے ذاتی مفاد پر زد پڑے تو اسے برداشت کیا جائے اور قیادت کے حکم پر ہر قسم جانی و مالی قربانی کو "عبادت" سمجھا جائے، اتنی "عصبیت" تو بہر حال مطلوب ہے اور اس کے بغیر کوئی سیاسی تحریک مؤثر نتائج نہیں حاصل کر سکتی۔

مضبوط عسکری قوت کے قیام کی شرائط

بنی اسرائیل جس طاقتور اور جنگجو قوم سے اپنے حقوق کی جنگ لڑنے جا رہے تھے اس کے لیے محض جوش و خروش کافی نہ تھا، وقتی تحریک نے تو حضرت طالوت کی معیت میں لاکھوں لوگ کھڑے کر دیئے لیکن روایات کے مطابق حضرت طالوت نے تین شرائط عائد کیں کہ میری فوج میں وہ شخص شامل ہو سکے گا جو نوجوان ہو، کیونکہ جنگ و جہاد کی سختیوں میں جوان خون اور جسمانی طاقت بہر حال ضروری ہوتی ہے۔ دوسری شرط یہ لگائی کہ شامل ہونے والے نشیط اور چست ہوں کیونکہ بدنی اعتبار سے سست و کاہل لوگ جہاں خود کام کے اہل نہیں ہوتے وہاں ماحول کو متاثر کرتے ہیں اور ان کی کاہلی کا اثر دیگر افراد پر آتا ہے، نیز وہ امیر جماعت کے لیے ٹھیک ٹھاک درد سر بن جاتے ہیں، قوموں کی آزادی کی جدوجہد میں ایسے مراحل بارہا آتے ہیں جب خود بھی سنبھلنا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی سہارا دینا ہوتا ہے جبکہ ایسے کاہل لوگ خود کو سنبھال پانے کی بجائے دوسروں پر بوجھ بن جاتے ہیں، یوں فوج کی ایک بڑی توانائی انہیں محفوظ کرنے میں صرف ہونے لگتی ہے۔ تیسری شرط یہ عائد کی کہ شامل ہونے والا مکمل فارغ ہو، تحریکات میں دماغی یکسوئی نہ ہو تو جم کر کام نہیں ہوتا اس میں وہی شخص

پوری دلجمعی کے ساتھ مؤثر کردار ادا کرپاتا ہے جو ہر طرح کی پریشانی، بوجھ اور جھمیلوں سے آزاد ہو ایسا شخص ہی بے پرواہو کر جان لڑاتا ہے اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔

تحریکات میں منتہائی قربانی کے معیار پر پورا اترنے کی شرائط

حضرت طالوت کا لشکر روایات کے مطابق اسی ہزار کے لگ بھگ تھا، یہ لوگ حضرت طالوت کی شرائط پر گرچہ پورے تھے تاہم تحریکات میں منتہائی قربانی کے لیے جن جانثاروں کی ضرورت ہوتی ہے ان کا صرف بھرتی کی شرائط پر پورا اترنا کافی نہیں ہوتا بلکہ ان کے مزید امتحانات لیے جاتے ہیں۔ جب یہ لشکر طویل مسافت طے کر کے تھکا ہارا جارہا تھا تو حضرت طالوت نے بتایا کہ اس بھوک و پیاس کی شدت میں خداوند قدوس تمہیں پانی کے نہر پر آزمائے گا جو اس میں کامیاب ہوا وہ میرے ساتھ چل سکے گا ورنہ اس معرکہ سے رہ جائے گا۔ جب یہ لشکر دریائے اردن کے کنارے پہنچا اور پیاس کی شدت سے گلے خشک تھے عین اسی وقت حضرت طالوت نے حکم جاری کیا کہ ایک چلو سے زیادہ پانی کوئی نہیں پیے گا۔ پیاسا آدمی جب بھوکا بھی ہو اور وہ جی بھر کر پانی پی لے تو طبی طور پر اس کے قوی و اعضا سست پڑ جاتے ہیں، آگے جنگ کا مرحلہ تھا جس میں نشاط و تازگی کی ضرورت تھی، تاہم اس اسی ہزار کے لشکر میں بجز تین سو تیرہ افراد کے کوئی اس حد کو قائم نہ رکھ سکا اور سبھی وہیں پڑے رہ گئے۔

نبوی سیاست میں منتہائی مراحل کے کارکنوں کی خاص صفات

اتنے بڑے لشکر کے یوں ڈھیر ہونے میں اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت تھی کیونکہ ہمراہیوں کے عزم و استقلال میں ذرا بھر کی جنبش جیتے ہوئے میدان کو شکست گاہ میں تبدیل کر سکتی ہے، آگے کے معرکے کے لیے جس ایمان و ایقان کی ضرورت تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ کڑا امتحان لیا جائے اور نفس کی چاہت کی طرف معمولی میلان رکھنے والوں کو صفوں سے جدا رکھا جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قوموں کو بحرانوں سے نکالنے کے لیے تحریکات میں بعض مراحل ایسے آتے ہیں جن میں ہر کارکن کام نہیں دے سکتا ایسے مراحل خاص تربیت یافتہ افراد ہی سر کر سکتے ہیں۔

اس میں ان تین سو تیرہ افراد کی بھی آزمائش تھی کہ اتنے بڑے لشکر کے عین موقع جنگ پر

پسپا ہونے کے بعد خود ان کی قلبی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ جو لوگ فنا فی اللہ ہوں، ان کی توحید اس درجہ کامل ہوتی ہے کہ خداوند قدوس کی طاقت و قوت کے سامنے انہیں دنیا کے لشکر و سپاہ پرِ کاہ کے برابر دکھائی نہیں دیتے، وہ حکم خداوندی کی تعمیل میں "براہیمی نظر" سے آگے بڑھتے ہیں، ان کے انتقال امر کے جذبہ کی اساس "عقل" کی بجائے "عشق" ہوتی ہے، اور عشق زمینی حقائق اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج سے بے نیاز ہوتا ہے، یہ محض عقلاء کا نہیں بلکہ عشاق کا گروہ تھا، تاریخِ انسانی میں اس گیتی پر بڑے طاغوتوں کے استیصال کا معرکہ ہمیشہ عشاق ہی لڑتے آئے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

> جب حق و باطل کا معرکہ پیش آتا ہے اور حق کی جانب سے مخلصین کاملین فداکارانہ جذبات کے ساتھ حمایت حق کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان خوداعتمادی اور توکل علی اللہ کی روح سرایت کر جاتی ہے تو پھر کامرانی وکامیابی کا مدار قلت و کثرت پر نہیں رہتا بلکہ قلت کثرت پر بھاری ہو جاتی اور کثرت قلت سے مغلوب ہو کر شکست کھا جاتی ہے، یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار قرآن عزیز نے اس طرح کیا ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (اور بارہا چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جامعت پر غالب آجاتی ہے۔) (قصص القرآن، ج:۲، ص:۵۶)

سیاسی تحریکوں کی راہ میں میٹھے دریا

تحریکات میں نفسانی خواہشات جگہ جگہ انسان کو راہ سے بھٹکانے کے درپے رہتے ہیں۔ اگر انسان نفس کو قابو رکھنا سیکھ لے اور راستے میں آنے والے میٹھے دریاؤں میں منہ نہ مارے تو وہ منزل پار کر لیتا ہے لیکن جو لوگ جنگ و جہاد اور آزادی کی تحریکوں میں نفس کی چاہتوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر وقتی، عارضی مفاد کی خاطر راستے کی چمک دمک اور عہدہ ومال کے میٹھے کا شکار ہو جائیں تو وہ اپنی منزل کی راہ کھوٹی کر لیتے ہیں۔

نبوی سیاست میں خدا کا حکم مقدم ہوتا ہے زمینی حقائق نہیں

یہ مختصر سا لشکر اشدو دی کمانڈر جالوت کے ایک بڑے لشکر کے سامنے مادی اعتبار سے کچھ نہیں تھا، ان کے سامنے اظہار کیا گیا کہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ ہمارے اور جالوت کے لشکر میں سرے سے کوئی توازن و تقابل ہی نہیں، عقل یہی کہتی ہے کہ ایسی طاقت سے ٹکرانا اپنی نسل کشی کے مترادف ہے اور اس بے نتیجہ ٹکراؤ کی بجائے بزدلی کے امن کو ترجیح دے کر طاقتور قوم کے نظریہ اور آڈیالوجی کے مطابق نظم زندگی طے کر دیا جائے کہ بظاہر عافیت کی راہ یہی دکھتی ہے لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت کا استحضار ہو اور جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو زندگی کا مقصد و منتہا سمجھتے ہوں، ان کے نظریے سے کوئی مادی طاقت ٹکرا کر کامیاب ہو جائے تاریخ انسانی اس کا اباء کرتی ہے، یہاں بھی اہل ایمان نے یہی کہا جن کا نظریہ محض اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے مرمٹنا اور اللہ کے دربار میں سرخرو ہو کر حاضر ہونا تھا کہ بہت ساری کم تعداد جماعتیں اللہ تعالیٰ کی مدد سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ ایسے لوگوں کے ہاں ہدف کی جدوجہد ہی مقصد ہوتی ہے، جب جدوجہد ہی مقصد ٹھہرے تو انسان جدوجہد میں جان کھپا دیتا ہے چاہے نتیجہ ملے نہ ملے اور یہی کامیابی ہے۔

قدم ہو راہ الفت میں تو منزل کی ہوس کیسی
یہاں تو عین منزل ہے تھکن سے چور ہو جانا

ایمان کے اس امتحان میں کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی نصرت متوجہ ہوتی ہے، فوج کے ایک کم سن نوجوان داؤد (علیہ السلام،) نے اشدودی کمانڈر جالوت کو قتل کر دیا تو اشدودی لشکر ان اہل ایمان کے سامنے بغیر چرواہے کے ریوڑ سے زیادہ حیثیت میں نہ رہا۔ یوں فتح اہل ایمان کی رہی۔

تحریک کے منتہائی مرحلہ میں تین سو تیرہ افراد باقی رکھنے کی حکمت

اس آزمائش کی ایک حکمت یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ بنی اسرائیل کی اس تحریک کا بنیادی محرک وطنی و قومی جذبہ تھا، گو کہ یہ جذبہ کوئی مذموم نہ تھا، تاہم ایسی ریاستیں جو خداوند قدوس کی محبت و اطاعت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے مشن کے لیے وجود میں آئیں، ضروری ہوتا ہے کہ ان ریاستوں

کی بنیاد میں محض خداوند قدوس کی محبت و عشق کا جذبہ کارفرما ہو، اس میں کوئی دوسرا مقصد خواہ وہ جائز ہی کیوں نہ ہو، کی آمیزش نہ آنے پائے، اس لیے معرکہ کے منتہائی مرحلہ پر محض ان ہی افراد کو باقی رکھا گیا ہے جن کا واحد مقصد خداوند قدوس کے دربار میں حاضری اور ملاقات کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنا تھا۔

سیاسی تحریکوں کے بنیادی جوہر

ان اہل ایمان نے میدان جنگ میں اللہ تعالیٰ سے صبر مانگا کہ صبر کے بغیر کوئی تحریک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی، صبر سے دل مضبوط ہوتا ہے اور یہی ثابت قلبی ثابت قدمی کی بنیاد بنتی ہے۔ تو صبر و استقامت یعنی ثابت قلبی و ثابت قدمی سے کی گئی جدوجہد ہی نتیجہ خیز ہوتی ہے، اسی پر اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد متوجہ ہوتی ہے اور اس کے بعد ہی کامیابی قدم چومتی ہے۔ جب تک کارکن میں ثابت قلبی و ثابت قدمی پیدا نہ کی جائے کوئی تحریک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ ملک و ملت کو بحرانوں سے نکالنے کا معرکہ سر کر سکتی ہے اس ٹھوس حکمت عملی کے نتیجے میں جو حکومت قائم ہوئی وہ تیسری نسل یعنی عہد سلیمانی میں جا کر پوری دنیا پر پھیلی، ایک مہاجر کیمپ سے اٹھنے والی قوم نے اپنے مسائل پر کیسے قابو پایا، ترقی کا سفر طے کر کے ساری دنیا پر کیسے پھیلی، قرآن مجید نے اس کی بنیادیں مہیا کی ہیں، واقعی سیاست وحی کے نور کے تحت ہو تو قوموں کی نیا پار ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

اسلامی سیاست میں معاش کا تصور اور معاشی بحرانوں کا حل

انبیاء کرام علیہم السلام کو علوم معاد کے ساتھ علوم معاش بھی عطا کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ دنیا رہ گزر اور دارالاسباب ہے، یہاں اگرچہ قلب میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت مال ومتاع پر ہر حال میں غالب رکھنی ہے، تاہم مال کی نفس محبت و مرغوبیت بندہ مؤمن کی سرشت میں رکھی گئی ہے، مال ایک درجہ میں مطلوب ہے کیونکہ اس کے بغیر گزران ناممکن ہے۔ اسی طرح اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اس مادی کائنات میں درکار مادی وسائل واسباب بھی ایک مضبوط معاش کے رہین منت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے "مال" بطور وسیلہ و انعام عطا فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے مال کی اس حیثیت کو "جعل اللّٰه لكم قياما" سے تعبیر کر کے واضح کیا ہے کہ مال انسانی معاش اورعالم انسانی کے قیام کاذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اس کی طلب کو "فريضة بعد الفريضة" کہاگیاہے اور اس کے لیے کی جانے والی سعی اور کوشش "عبادت" بتلائی گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "نعمابالمال الصالح للرجل الصالح" (مشکوٰۃ) یعنی نیک آدمی کے لیے اچھااور پاکیزہ مال بہترین متاعِ حیات ہے۔ اسی طرح نصوص میں تجارت کے لیے "فضل اللہ" خوراک کے لیے "الطيبات من الرزق"، لباس کے لیے "زينة اللہ"، رہائش کے لیے "سکن" (سکون کی جگہ) اوراموال کے لیے "خیر" (بھلائی) جیسے احترامی القاب استعمال کیے گئے ہیں اور مال ودولت کی حفاظت کابھرپورداعیہ بھی دلوں میں پیداکیاگیاہے، یہاں تک کہ اگر مال کی حفاظت کے لیے جان کا قیمتی سرمایہ پیش کرنے کی نوبت بھی آجائے تواسے نہ صرف گواراکیاگیاہے بلکہ ایسے

شخص کو شہادت کے اجر کی خوشخبری بھی سنائی گئی ہے۔ان تمام ارشادات سے اسلام کی نظر میں مال کا تصورایک محبوب ومطلوب چیز کی شکل میں سامنے آتاہے۔

لیکن جب ہم غورکرتے ہیں توہمیں اسلامی لٹریچرمیں دنیااوردنیاوی مال کے لئے متاع الغرور، فتنہ اور لعب و لہو کے الفاظ بھی ملتے ہیں، نیز ڈھیروں روایات میں مال و دنیا کی مذمت اور اس کی محبت پر اخروی عذاب کی وعیدیں آئی ہیں، جن سے مال کا ایک بھیانک تصور سامنے آتا ہے۔کوتاہ نظری اس موقع پر تضادکاشبہ بھی پیداکرسکتی ہے لیکن بغورجائزہ لینے پرواضح ہوتاہے کہ اسلام کی نظرمیں تمام ترمالی وسائل معاش وانتظام عالم کے محض ذرائع اورانسانی رہ گذرکے مرحلے ہیں،اس کی اصل منزل درحقیقت ''ما ل ودولت'' سے آگے کردارکی بلندی اوراس کے نتیجے میں آخرت کی بہبودی ہے،انسان کااصل مسئلہ اوراس کی زندگی کابنیادی مقصدانہی دومقاصد کی تحصیل ہے،لیکن چونکہ ان منزلوں کوشاہراہ ِدنیاسے گزرے بغیر حاصل نہیں کیاجاسکتااس لئے مال کاحصول بھی انسان کے لیے ضروری ہوجاتا ہے، لہٰذاجب تک مال انسان کی اصلی منزل کے لیے رہگذرکا کام دے، تو وہ فضل اللہ، خیراور زینۃ اللہ ہے لیکن جہاں انسان اس رہگذر کی بھول بھلیوں میں الجھ کررہ جائے اور اس پراپنی اصل منزل مقصودکوقربان کرڈالے یاباالفاظ دیگرمال ہی منزل مقصودبنالے تو یہی مالی وسائل ''متاع الغرور، فتنہ اور لعب و لہو'' بن جاتے ہیں۔

اسی تناظر میں انسان اور مال کا باہمی تعلق ''کسب'' بتلایا گیاہے، یعنی انسان مال کامالک نہیں بلکہ محض کاسب ہے ، جہاں کہیں اس کی ملکیت کاذکرہے وہ ملک حقیقی نہیں بلکہ عطائی ہے اور انسان کے پاس بطور نائب اور خلیفہ مال میں وقتی اور عارضی تصرف کا اختیار ہے جسے استعمال کرنے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو حدودوقیودکاپابندبنایاہے۔اس تجزیے سے اسلام کی نظرمیں مال کی حیثیت پوری وضاحت سے سامنے آجاتی ہے کہ نہ تو مال شجرِممنوعہ ہے کہ اس کے ساتھ راہبانہ رویہ برتاجائے اورنہ ہی مقصدزندگی کہ اس کی پوجاپاٹ میں

ساری قوتیں صرف کرلی جائیں بلکہ یہ کارگاہِ حیات کی ایک ضرورت ہے، جس کے حصول وصرف میں خداوند کریم کے احکامات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اسلامی معاش کی مابعد الطبیعاتی بنیادیں

اسلامی سیاست کا ایک بنیادی عنصر قوم کو مستحکم معاشی بنیادیں فراہم کرنا بھی ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے جو اقتصادی تعلیمات پیش کیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کیں ۔ جیسے ہر نظم کا ایک مابعد الطبیعاتی یا فکری پس منظر ہوتا ہے جس پر اس کی بنیادیں استوار کی جاتی ہیں، اس طرح حضرت محمد ﷺ کی پیش کردہ تعلیماتِ اقتصاد و معاش کی چند مابعد الطبیعاتی اور فکری بنیادیں ہیں، حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ ان بنیادوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پہلی بنیاد اللہ تبارک و تعالیٰ کی رُبوبیت کُبری اور رزاقیت مطلقہ کا تصور ہے کہ اصلاً پوری انسانیت کی پرورش و ضروریات کی کفایت اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ قرآن کریم کی بے شمار آیات واحادیث مبارکہ کا ذخیرہ اس حقیقت پر گواہ ہے۔ ربوبیت الٰہیہ کا یہ نظام گو کائنات کے ذرہ ذرہ میں جاری و ساری ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق چونکہ انسان نرا حیوان یا "بڑھیا حیوان" نہیں بلکہ خلیفہ الٰہی اور انسانی شرف و فضیلت کا حامل ہے اور اس کی زندگی اور ضروریات زندگی صرف اس عالم ہی میں ختم نہیں ہو جائیں گی، اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کے نظام کی انسان کے بارے میں چند موٹی موٹی بنیادوں پر بنا رکھی۔
>
> (۱) اس کی دنیاوی و معاشی بنیادی ضرورتیں کسی صورت میں نظر انداز نہ کی جائیں اور اس میں مؤمن و کافر کی بھی تخصیص نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ہی ان ضرورتوں کی کم از کم تحدید فرما کر اعلان فرمادیا تھا: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۔ (طٰہٰ:۱۱۹،۱۱۸)

بلاشبہ تمہارا یہ حق ہے کہ تم یہاں نہ بھوکے رہو اور نہ ننگے رہو اور یہ کہ تم نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کی تپش اٹھاؤ۔

یعنی انسان کے کم از کم بنیادی حقوق چار ہیں: روٹی، کپڑا، پانی اور مکان۔

آیت بالا کا تعلق دنیا سے نہیں، جنت سے ہے، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں داخل کرتے ہوئے ان سے یہ فرمایا گیا تھا کہ تمہیں یہاں بھوک، پیاس، برہنگی اور دھوپ سے سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ البتہ اس سے بطور 'اشارۃ النص' یہ سمجھا جاسکتا ہے، کہ ہر انسان کی کم از کم یہ چار ضرورتیں ایسی ہیں جنہیں پورا کرنے پر وہ مجبور ہے۔

(۲) چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ اور جملہ انبیاء علیہم السلام کے نزدیک انسان کی ضروریات صرف اس عالم ہی میں منحصر نہیں۔ بلکہ یہ عالم ایک رہ گزر ہے جہاں سے چل کر انسان کو اپنے اصلی ٹھکانے آخرت میں پہنچنا ہے، جہاں اس کا ہمیشہ کا قیام ہو گا، اس لئے اس کے حقوق کا نظام اور اس کی دنیاوی حاجتوں کی کفایت کا حکیمانہ طریقہ وہ مقرر کیا گیا کہ یہاں کی ضروریات بھی بطرز احسن پوری ہوں اور آخرت کی زندگی بھی اس کے ساتھ بنتی چلی جائے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا۔(ھود:٦)

اور نہیں کوئی چلنے والا زمین پر مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ اس کا رزق ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تھوڑے (عرصہ) رہنے کی جگہ اور زیادہ (عرصہ) رہنے کی جگہ کو بھی جانتا ہے۔

چنانچہ حدیث پاک میں دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا گیا کہ انسان کے ہر عمل کا پھل اسے آخرت میں ملے گا۔ اس لئے حضرت محمد ﷺ نے جو طریقہ حیات دیا وہ بیک وقت دین و دنیا دونوں کی بھلائی اور کفالت کا ضامن ہے۔

(۳) انسان چونکہ خلیفۂ الٰہی ہے اس لئے اس کے خلافت الٰہیہ کے جواہر و خصائص اور کمالات کے بقا کو اس تعلیم معاش و اقتصاد میں اس کے حیوانی تقاضوں سے بڑھ کر اہمیت دی گئی ہے۔ خلافت کے جواہر سے ہماری مراد انسان کی وہ اعلیٰ اقدار ہیں جو اخلاقِ فاضلہ، رحم و کرم، جود وسخا، صبر وشکر، قربانی و ایثار، اخلاص و بے نفسی، غمگساری و چارہ سازی، محبت و الفت وغیرہ اوصاف حمیدہ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ ان جواہر کی بقااور آخرت کی زندگی کے بناؤ کے لئے مختلف و متضاد صلاحیتوں کے انسانوں کے لئے محمد رسول اللہ ﷺ نے معیشت واقتصاد کی ایسی منصفانہ اور عادلانہ تعلیمات پیش کیں جن میں ہر فرد و طبقہ اپنی جملہ صلاحیتوں کو بطریقہ احسن بروئے کار لاسکے۔ اس کی دنیاوی اور معاشی حاجتیں بھی کماحقہ پوری ہو جائیں اور اس کے اخلاق فاضلہ کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے۔ بلکہ ہر طبقہ اور ہر گروہ کا انسان اس نظام معاش و اقتصاد میں محبت وچین، سکون و اطمینان اور بھائی چارے کی زندگی گزار سکے، جس میں طبقاتی کشمکش، گروہی کشاکش، باہمی جنگ وجدل اور رقابت و منافرت کے جذبات کار فرمانہ ہوں، بلکہ ہر طبقۂ انسانی دوسرے طبقہ کا ہمدرد، غمگسار، معاون و مددگار، خیر خواہ اور خدمت گار بن کر زندگی گزارنے کو اپنی نجات وکامیابی کا ذریعہ سمجھے۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم معاش و اقتصاد میں مزدور کے مفادات کی نگہداشت کو سرمایہ دار کا دین بنادیا گیا ہے اور کاشتکار کے حقوق کی ادائیگی زمیندار کا مذہب قرار دیا گیا ہے۔ مالدار کی جائز حاجتوں کو پورا کرنا مزدور کے لئے عبادت ٹھہری اور زمیندار کے حقوق کی ادائیگی کاشتکار کے لئے نیکی بنادی گئی۔ حاکم و محکوم، کاشتکار و زمیندار، مزدور ومالدار ہر طبقہ وہر گروہ کے مفادات کو آپس میں ٹکرایا نہیں بلکہ انسانیت کی بنیاد پر جملہ طبقات کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے انہیں آپس میں ایک جسد واحد کی طرح جوڑ دیا گیا کہ رب

العالمین کے فرستادہ رحمۃ اللعالمین ﷺ انسانوں میں منافرت و حقارت، جنگ و جدل کے جذبات کو سازشوں یا انقلابی دعوؤں کے ذریعہ بھڑکانے نہیں آئے تھے بلکہ آپ کا پیام باہمی الفت و محبت، بھائی چارہ و یگانگت، انسانی ہمدردی و غمگساری کا پیام تھا۔ بقول رومی انبیا علیہم السلام توڑنے نہیں آتے جوڑنے آتے ہیں۔ وہ مختلف طبقات کو آپس میں لڑاتے نہیں آپس میں ملاتے ہیں:

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

قرآن عظیم نے حضور انور ﷺ کے اس "اخوت انسانیہ" کے انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾

(اٰل عمران:۱۰۳)

ترجمہ: جب کہ تم (ایک دوسرے) کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت پیدا کر دی تو اب تم اس کے انعام و فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔ (مقالات اشرف: ج: ص: ۲۵۴تا۲۵۶)

دنیا میں برپا معاشی بحرانوں کی بنیادیں

اسلام کے نظم سیاست میں معاش و اقتصاد کی خصوصیات و خوبیوں کو واضح کرنے اور اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی روشن تعلیمات پیش کرنے سے قبل ضروری ہے کہ دنیا میں رائج معاشی نظاموں کی خون آشامی کا قدرے ذکر کیا جائے تاکہ اسلام کی عبقری تعلیمات کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہو سکے اور انہیں سمجھنے میں آسانی ہو، اس سلسلہ میں مولانا سلیمانیؒ لکھتے ہیں:

دنیا میں عموماً معاشی بحران اور اقتصادی فساد جن وجوہ سے پھیلتا ہے ان میں سے پہلی وجہ سرمایہ داری کا وہ ظالمانہ و بہیمانہ نظام ہے جسے قرآن نے قارونیت و اکتنازیت (ارکتاز دولت) کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کی بنیاد شخصی یا

طبقاتی فوائد (VESTED INTERESTS) خود غرضی اور ذاتی منافع پر ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار دولت و زمین کو اپنی پیدا کردہ ذاتی ملک سمجھتا ہے اور اس کے تصرف و نمو کا اپنے کو مختار مطلق گردانتا ہے۔ جس میں وہ کسی خدائی ضابطہ یا حقیقی اخلاقی اقدار کا پابند نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ملت و انسانیت اور دیگر طبقات انسانی کے مفادات کو اپنا ذاتی مفاد اور ان کے نفع و ضرر کو اپنا نفع و ضرر سمجھتا ہے۔ قرآن کریم نے سرمایہ دار کے اس ذہن کا ارشادہ قارون اور قوم شعیب علیہما السلام کے الفاظ میں بالترتیب اس طرح ذکر فرمایا ہے۔

قارون کہتا ہے:

﴿قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾۔ (القصص:۷۸)

ترجمہ: اس نے کہا: یہ سب مال و دولت مجھے اپنے ذاتی ہنر مندی سے ملا ہے۔ (اس لئے میں اس کا مالک حقیقی ہوں اور اس لئے مجھے اس پر ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے۔

قوم شعیب نے کہا:

﴿اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا﴾ (ھود:۸۷)

ترجمہ: کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم باپ، دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا حرام کر دیں۔

گویا سرمایہ دار مال و دولت کو صرف اپنی ملک سمجھتا ہے اور اس میں ہر جائز و ناجائز تصرف کو اپنے ذاتی مصالح و مفادات کے ماتحت جائز سمجھتا ہے خواہ اس کے اس عمل سے دوسرے طبقات کے حقوق کلیۃً یا جزئیۃً سلب ہو جاتے ہوں۔ قرآن کریم نے سرمایہ دار کی اس ذہنیت کا تذکرہ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے ایک پیش شدہ مقدمہ کے تذکرہ میں تفصیل کے طور پر کیا ہے کہ

ان کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا۔ اس میں دو فریق تھے۔ ایک کے پاس ننانوے دنبیاں تھیں۔ دوسرے کے پاس ایک دنبی۔ ایک دنبی والے نے مرافعہ کیا کہ ننانوے دنبیوں والا کہتا ہے کہ یہ ایک دنبی بھی مجھے دے دے کہ میری سو پوری ہو جائیں، ہمارے نزدیک سرمایہ دار کی حرص وآز کا یہی عالم ہے وہ ہر جائز وناجائز ذریعہ سے دولت کے جملہ منابع اور ذرائع پر قبضہ کرلیتا ہے اور چند دنوں میں دولٹ سمٹ کر چند ہاتھوں میں آجاتی ہے وہ پاکستان کے بائیس خاندان ہوں یاامریکہ کے دوسو بیس خاندان۔

سرمایہ داری کی بنیاد جن بڑے بڑے ستونوں پر قائم ہے وہ بے لگام، آزاد و باطل نجی ملکیت کے علاوہ سود، قمار، سٹہ، ناجائز خرید و فروخت، احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی اور دیگر ناجائز آمدنیاں ہیں۔ اس نظام پر تفصیلی نقد و تبصرہ کا یہ موقع نہیں اتنا بتانا کافی ہے کہ یہ ظالمانہ نظام انسانیت کے جملہ اخلاقی و عادلانہ تقاضوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کے ضمن میں زمینداری کا وہ غیر اسلامی نظام (FEUDAL SYSTEM) بھی ہے جو کسی خدائی ضابطہ اور حدود و قیود کا پابند نہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں ''دولت'' کی ناجائز و غلط لوٹ کھسوٹ کے رد عمل میں وہ منفی نظام جسے اشتراکیت واشتمالیت اور انقلابی سوشلزم وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ہر اس دور میں وجود میں آتا رہا ہے جب بھی سرمایہ کی بد عملی نے نادار طبقات کی زندگی اجیرن کر دی ہے، چنانچہ مصر قدیم میں فراعنہ کے عہد میں اس کے نقوش ملتے ہیں۔ افلاطون نے نظریاتی طور پر اسے کسی حد تک پیش کیا، مشہور یونانی مقنن سولن کے عہد میں سپارٹا میں لیکار گاس نے اصول اشتراکیت کے مطابق دولت کو مساوی تقسیم کر دیا۔ ایران قدیم میں مزدک نے زن، زر، زمین کے عام ہونے کا نعرہ لگایا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ کے حالات نے اس ذہن کو جلا بخشی، جس کا سب سے بڑا قائد کارل

مارکس ہے، جس نے انجیلوؔ کے ساتھ مل کر اشتمالیت و اشتراکیت کو ایک مستقل مذہب بنادیا اور بیسویں صدی میں لیننؔ نے اسے عملی صورت بخشی اور اب روس و مشرقی یورپ کے علاوہ چین میں ماؤزےؔ تنگ کی سرکردگی میں وہ ایک مستقل نظام حیات کی صورت میں رائج ہے اور دیگر ممالک میں بھی پر وبال نکالنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اشتراکیت غلط سرمایہ کاری کے رد عمل میں وجود میں آتا ہے اس لئے اس کا مزاج ہر اس بات کا انکار کرتا ہے، جو سرمایہ دارانہ نظام معاش میں ساری و طاری ہیں۔ ''رد عمل'' کے غیض و غضب میں وہ سرمایہ دارانہ نظام کے غلط مالی خاکوں کو ہی نہ صرف مٹانا ہے بلکہ جو چیز وہاں رائج تھی اس کا قلع قمع بھی کر دیتا ہے۔ یورپؔ کے زمانہ وسطی کے حالات جن کے رد عمل نے مارکسزم کو جنم دیا اس نظام پر اس طرح اثر انداز ہوئے کہ اس نے نہ صرف اقتصادی نظام کی نفی کی، بلکہ بقول اقبال:

کہ وہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا کلیسا لا سلاطین ولا الہ

کا وہ منفی نعرہ بلند کر دیا جو اشتراکی نظام کی رگ و پے میں سرایت کر گیا اور اشتراکیت کی بنیاد میں انکار خدا، انکار آخرت اور انکار اقدار روحانیہ اور اثبات پیٹ و مادیت سمو دی گئی۔

گویا اب اشتراکیت ایک ملحدانہ نظام زندگی قرار پایا جس میں خدا کی جگہ کارؔل مارکس نے، صحیفہ آسمانی کی جگہ کیپٹل نے اور پیغمبر کی جگہ لنین اور مائوزے تنگ نے لے لی۔

اس اقتصادی نظام کی بنیاد ہیگل کے جدلیاتی نظریہ اور ڈارون کے ارتقائی نظریہ کی بنیادوں پر استوار ہونے کے بعد باہمی طبقاتی کش مکش اور مزدور و کسان اور سرمایہ دار و زمیندار کی باہمی آویزش قرار پائی۔ یہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ دنیا میں اصل مسئلہ پیٹ اور صرف پیٹ کا ہے۔ اس ''بڑھیا

حیوان" کی حیوانی زندگی کی ضروریات کے جو مصادر و منابع تھے باہمی کش مکش میں سرمایہ داروں نے قوت و حیلے سے ان پر قبضہ کر کے ایک بڑے طبقہ کو آسائش زندگی سے محروم کر دیا اور سرمایہ کے دھوکے اور فریب نے غریب اور مزدور کو پھانسنے کے لئے مذہب کا افیون ایجاد کیا اور خدا، پیغمبر اور آخرت وغیرہ کے نظریات اور دین کے حدود قیود میں اسے الجھا کر پیٹ کے اصل مسئلہ سے بیگانہ کر دیا۔ اس لئے اشتراکی نظریہ میں جیسے سرمایہ دار کا وجود گالی ہے اسی طرح نظریاتی اور عملی طور پر اشتراکی سوسائٹی میں خدا، پیغمبر اور دین کا وجود بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں ایک ہی نظریہ جاری ہو گا اور ایک ہی کی بات چلے گی۔ وہ مارکس و لینن ازم کی بات ہو یا چیرمین ماؤزے تنگ کی جیسے ایک مملکت میں دو بادشاہ نہیں سماسکتے۔ اسی طرح اشتراکی مملکت میں "اشتراکی مذہب" کے سوا دوسرا دین عملاً نہیں سما سکتا جو اس کا انکار کرتا ہے وہ حقائق کو جھٹلاتا ہے خصوصاً اسلام جیسا مذہب جو زندگی کے جزو کل پر حاوی ہے۔ اشتراکی نظریات کی بقا کے ساتھ اس کا وجود قطعاً باقی نہیں رہ سکتا۔

اشتراکیت چونکہ نادار (HNES) اور مالدار (HANENTS) کی آویزش کی نقیب ہے۔ اس لئے انسانی آبادی کا وہ کثیر حصہ جیسے سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام نے قلاش بنادیا ہے یعنی مزدور و کسان، اس کے مسائل کے حل کرنے کی دعوت لے کر وہ آگے بڑھتی ہے گویا وہ ایک "طبقہ" کے مسائل کے حل کی داعی ہے اور "پوری انسانیت" کے مسائل کے حل کا وہ خود بھی دعویٰ نہیں کرتی۔ اشتراکیت ذرائع آمدن اور مصادر و منابع پیداوار کی عام ملکیت کی قائل ہے۔ اس لئے "نجی ملکیت" کا وہ قطعاً انکار کرتی ہے۔ لیکن عملاً اشتراکی ممالک میں "مصادر و منابع پیداوار" مملکت کی ملکیت قرار پاتے ہیں اور مملکت کی باگ ڈور چونکہ "کمیونسٹ پارٹی" کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو کہ ایک "مخرومی پارٹی" ہوتی ہے جس پر صرف چند جوش کے لیڈروں کا عملاً اختیار ہوتا ہے اس

لئے سب دولت و سرمایہ کے سپید و سیاہ کے مالک و حاکم اور مختار کل کمیونسٹ پارٹی باالفاظ دیگر اس کے چند سر کردہ لیڈر قرار پاتے ہیں۔ جن کے خلاف کسی آواز اکا اٹھانا بغاوت قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح اشتراکی ممالک میں دولت وزر غریب مزدور وکسان کو نہیں ملتا، بلکہ سرکاری ملکیت بن کر عملاً کمیونسٹ پارٹی کے قبضہ میں چلا جاتا ہے اور اس کے منابع بھی برابر تقسیم نہیں ہوتے بلکہ جیسا کہ روس و دیگر ممالک کی تنخواہوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تنخواہیں ۸۰ روبل یعنی ۵۰۰/۰۰ روپے سے تیس ہزار روبل یعنی چھ ہزار روپے تک چلی گئی ہیں۔(COMADE YVON بحوالہ اکنامکس آف اسلام صفحہ:۶۵)

بہر حال اشتراکی تحریک مزدور کسان اور نوجوان طالب علموں کو سبز باغ دکھا کر ایسے نظام میں قید کر دیتی ہے جس سے بدتر آمرانہ نظام تاریخ میں نہیں دیکھا گیا۔ اقبالؔ نے سچ کہا ہے:

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اسلام نے ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے رد عمل غیر فطری و باطل اشتراکی نظام کے مقابلہ میں جو نظام اقتصاد و معاشیات دیا، وہ انسانی فطرت کے عین تقاضوں کے مطابق ہے۔ وہ جملہ انسانی طبقات کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ان کی روحانیت وآخرت کی کامیابی کا بھی کفیل ہے۔ معاشیات میں سب سے اہم مسئلہ ملکیت ''زمین ومال'' کا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام بے لگام آزاد نجی ملکیت کا قائل ہے۔ اشتراکیت قطعاً ''نجی ملکیت'' کی منکر ہے۔

(مقالات اشرف، ج:۱، ص:۲۵۶ تا ۲۶۰)

اسلامی تعلیماتِ معیشت کی خصوصیات

معیشت کے حوالے نبی کریم ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات میں اساسی چیز یہ ہے کہ اسلامی اقتصاد ومعیشت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، مالکیت اور حاکمیت پر ہے۔ انسانوں کا پالنہار وہی ذات ہے،

کائنات میں جو کچھ ہے اس کا مالک حقیقی وہی ہے، انسان کی ہر کاوش اور معیشت میں برتا جانے والا ہر طریقہ خدا کی حاکمیت کے تحت ہے، اس میں عقلِ معاش یا انسانی تجربات کی حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ حاکمیتِ الٰہی کے تحت محض آلات کی ہے۔ انسان کی خزائن ارض پر نجی ملکیت عارضی نوعیت کی ہے، جس پر وہ خدا کے دربار میں جواب دہ ہے، اسے حدود و قیود کا پابند بنا کر اختیار دیا گیا ہے اور یہی حدود و قیود اس کی آزمائش ہے کہ وہ ان کی پاسداری کر کے دنیا و آخرت کو سنوارتا ہے یا انہیں پامال کر کے دائمی ذلت و نکبت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ اس نکتہ کی بہترین وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حضرت محمد ﷺ کے لائی ہوئی تعلیماتِ اقتصاد و معیشت کی بنیاد چونکہ اللہ تعالیٰ کے قصور ربوبیت، مالکیت و حاکمیت وغیرہ پر ہے۔ اس لئے اسلام میں اصلاً کوئی انسان کس چیز کا حقیقی مالک اور متصرف نہیں ہو سکتا۔ کائنات اور اس کی جملہ اشیاء زمین اور اس کی جملہ چیزوں کا مالک و متصرف و مختار حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے جیسا کہ قرآن کریم کی بیشتر آیات کا منشاء ہے:
>
> لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔(اٰل عمران:۹)
>
> وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔(المنافقون:۷)
>
> لیکن اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انسانوں کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر مجازی طور پر اپنے احکام اور نازل کردہ حدود و قیود کی پابندی کے ساتھ مختلف طبقات انسانیہ کو ان کے مفادات کی رعایت کرتے ہوئے اور ان کی صلاحیتوں کو روبکار لانے کے لئے جتنا مناسب سمجھے "زمین و دولت" کا نجی مالک بنادے۔ یہ نجی ملکیت آزاد اور انسانی چاہتوں کی پابند نہیں ہو گی۔ بلکہ اس الٰہی نجی ملکیت کا نظام آمد و صرف ہر حیثیت سے احکام الٰہی کا پابند اور حدود الٰہیہ سے مقید ہو گا اور اس نجی ملکیت و دولت کا حصول و استعمال ایک امین کی حیثیت سے انسان کرے گا۔ مگر اسلام مقید اور پابند حدودِ الٰہی نجی ملکیت (Dvinecontrolel

prinate party) کی اجازت دیتا ہے۔ جس کی ایک ایک پائی کی آمد و صرف کا حساب اسے اللہ تعالیٰ کو دینا ہو گا اور اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق آمد و خرچ نہیں کرے گا تو وہ ایسا مجرم ہو گا جس کی عبادت تک بعض اوقات مقبول نہیں ہوں گی۔ حرام کی کمائی والے کی نماز و حج و زکوۃ بھی حضور انور ﷺ کے ارشادات کے مطابق مقبول نہیں ہیں۔ غرض حضور انور ﷺ کا نظریہ ملکیت کے بارے میں یہ ہے:

در حقیقت مالک ہر شے خدا است

ایں امانت چند روزہ نزد ما است

یہ مال و دولت و نجی ملکیت اصلاً فضیلت و شرف کا سبب نہیں بلکہ حکمت الٰہیہ نے اسے دے کہ انسان کے اخلاقی جواہر و کمالات کو پرکھنا چاہا ہے کہ کیا انسان خلیفۂ الٰہی اور ایک "انسان" کی حیثیت سے اس کا استعمال کرتا ہے یا حیوانوں اور درندوں کی طرح اخلاق کے تقاضوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک اصلِ کمال انسان کا مال و دولت نہیں بلکہ اس کا ایمان و عمل ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اس مقید و پابند حدود الٰہی نجی ملکیت کے نظام کو اس طرح قائم فرمایا کہ اسلامی نجی ملکیت کی اجازت ظالمانہ اور قارونی سرمایہ دارانہ نظام کو جہنم نہ بنادے، بلکہ دولت کی ایسی عادلانہ تقسیم ہو، کہ ایک ہموار معاش زندگی وجود میں آسکے، جس میں ہر طبقہ انسانی کا ہر فرد راحت و چین کی زندگی گزار سکے اور نہ صرف اس کی حاجات ضروریہ ہی پوری ہوں بلکہ وہ معاشرہ میں ایک وقار، خود کفیل، فارغ البال، انسان پروقار اور خدا پرست شخص کی زندگی گزار سکے۔ مقید اسلامی نجی ملکیت کو ارتکاز دولت کا سبب بننے سے روک کر اسلامی معاشیات کی ایک بنیاد قرار دیا گیا۔ قرآن کریم نے ایک مقام پر فرمایا:

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷)

ترجمہ: تاکہ دولت تمہارے تونگروں ہی میں سمٹ کر نہ رہ جائے۔

لیکن اسلام جہاں ارتکاز دولت کو روکتا ہے وہاں انسان کے اخلاق و روحانیت اور خلافتی کمالات کے بقاو ارتقا کے لئے مساویانہ تقسیم دولت کا بھی قائل نہیں ہے کہ اگر دولت سب میں برابر تقسیم ہو جائے تو جود وسخا، صبر وشکر، ایثار و قربانی، بھائی چارہ وغمگساری وغیرہ اور انسانی صفات بھی ختم ہو جاتی ہیں اور انسان ایک بڑا حیوان یا ایک خود کار مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ انسانی قویٰ اور صلاحیتوں کے تفاوت کی بنا پر بھی یہ مساوات عادلانہ نہیں۔ کیا آپ کی عقل سلیم یہ گوارا کرتی ہے کہ ایک مجھ جیسا جاہل گنوار اور ایک یونیورسٹی کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ،ماہر وحاذق استاذ مالی و معاضہ کے لحاظ سے ایک ہی سطح پر لا کر کھڑے کر دیئے جائیں۔ اس لئے اسلام میں مالی مساوات کا نعرہ غلط ہے۔ اسلام کی نظام معاشیات میں مساوات نہیں مواسات یعنی ہمدردی و غمگساری ہے کہ ہر انسان کے درد کو اپنا درد سمجھو اور اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھ کر پورا کرو۔

قرآن کریم نے اس عدم مساوات کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ ۔(الزخرف:۳۲)

ترجمہ: ہم ہی نے دنیاوی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کو رکھا ہے۔ اور ہم نے ایک کو دوسرے پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾ (النحل:۷۱)

اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے۔

علاوہ ازیں اس اسلامی نجی ملکیت کا انکار قرآن کریم کے تقریباً ایک چوتھائی احکام کا ابطال اور اسلام کے پورے نظام معاش کا انکار ہے۔ یہ بات بھی قطعاً غلط اور اسلام کے اصول اقتصاد اور انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ کسی سے اس کی ساری نجی ملکیت کو طلب یا جبراً سلب کر لیا جائے۔ قرآن حکیم اپنے حکیمانہ انداز میں فرماتا ہے:

وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا یُؤْتِکُمْ اُجُوْرَکُمْ وَ لَا یَسْئَلْکُمْ اَمْوَالَکُمْ اِنْ یَّسْئَلْکُمُوْهَا فَیُحْفِکُمْ تَبْخَلُوْا وَیُخْرِجْ اَضْغَانَکُمْ۔(الحشر:۳۶،۳۷)

ترجمہ:اور اگر تم ایمان و تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے اجر عطا کرے گا اور تم سے تمہارا سارا مال طلب نہیں کرے گا۔ اگر تم سے تمہارے مال طلب کرے۔ پھر انتہا درجہ تک طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تعالیٰ (اس طرح تمہارے مال صرف کرنے کی فطری) ناگوای کو ظاہر کر دے۔ (دیکھو روح المعانی و تفسیر کبیر زیر آیت مذکورہ)

غرض اسلام نے نہ تو نجی ملکیت کو قطعاً ختم کیا ہے، نہ وہ اسے بالکل آزاد اور بے لگام چھوڑتا ہے، بلکہ عادلانہ قوانین کے اجراء سے ایسا مقید و پابند کر دیا کہ دولت کی ناہموار تقسیم ختم ہوگئی۔ نہ تو قارونی دولت کے ایسے مواقع چھوڑے کہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے۔ نہ نجی ملکیت کا انکار کر کے انسانی فطری ساخت کے خلاف ہر چیز کا مالک مملکت کو اور نہ عملاً ایک خاص طبقہ کے نمائندوں کو اس کا متصرف بنایا۔

(مقالات اشرف، ج:۱، ص:۲۶۱ تا ۲۶۴)

سرکار دوعالم ﷺ کے معاشی اصلاحات

قرآن مجید نے وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ۟ (بقرۃ:۲۷۵)[ترجمہ:اور اللہ تعالیٰ نے بیع

کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا۔]کا واضح اصول ارشاد فرما کر اسلامی معیشت کو بنیاد فراہم کی، نیز یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ (النساء:۲۹) [ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقوں سے نہ کھاؤ] کی بنیاد عطا کر کے معیشت میں ہر اس کھلے اور چور دروازے کو بند کر دیا جس سے انسانیت کا استحصال ہو سکتا تھا۔ نیز کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (الحشر :۷) [ترجمہ: تاکہ دولت تمہارے تونگروں ہی میں سمٹ کر نہ رہ جائے۔] کی ہدایت ارشاد فرما کر واضح کر دیا کہ اسلامی معیشت میں قطعاً اس کی گنجائش نہیں کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے اور باقی معاشرہ انکے رحم و کرم پر ہو۔ حضور اقدس ﷺ نے انہی ارشادات کی روشنی میں مروجہ معاشی ترتیبات میں جو اصلاحات فرمائیں، ان کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں تاہم مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) سرکار دو عالم ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کے بعد جب دیکھا کہ تجارتی منڈیوں پر یہود قابض ہیں اور معیشت کو پوری طرح اپنے پنجوں میں لے رکھا ہے تو آپ نے صحابہ کرام کے لیے مستقل بازار قائم فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم امت کو معاشی منڈیوں میں غیروں کے رحم و کرم پر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ انہیں اپنی عالمی منڈیاں قائم کرنی چاہئیں جہاں وہ قرآن و سنت کی معاشی ہدایات و تعلیمات کے مطابق آزادانہ تجارت کر سکیں۔

(۲) حضور اقدس ﷺ نے اس منڈی اور بازار کے لیے جو اصول وضع فرمائے، اس میں پہلی چیز اس منڈی کا ٹیکس فری ہونا تھا۔ یہاں اپنی مصنوعات، مبیعات و مزروعات کی آزادانہ خرید و فرخت کی اجازت تھی اور ہمہ قسم ٹیکس وصولی کو پر کلی پابندی تھی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن ابي اسيد، ان ابا اسيد حدثه، ان رسول الله صلى الله عليه وسلم ذهب إلى سوق النبيط فنظر إليه، فقال:" ليس هذا لكم بسوق"، ثم ذهب إلى سوق فنظر إليه، فقال:" ليس هذا لكم بسوق"، ثم رجع إلى هذا السوق، فطاف فيه، ثم قال:" هذا سوقكم فلا ينتقصن ولا يضربن عليه خراج".(رواہ ابن ماجہ)

ابو اسید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبیط کے بازار تشریف لے

گئے، اس کو دیکھا تو آپ نے فرمایا: "یہ بازار تمہارے لیے نہیں ہے پھر ایک دوسرے بازار میں تشریف لے گئے، اور اس کو دیکھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ بازار بھی تمہارے لیے نہیں ہے، پھر اس بازار میں پلٹے اور اس میں ادھر ادھر پھرے، پھر فرمایا: "یہ تمہارا بازار ہے، اس میں نہ مال کم دیا جائے گا اور نہ اس میں کوئی محصول (ٹیکس) عائد کیا جائے گا۔"

(۳) آپ نے بازار کے بڑے مالدار تاجروں کو منع فرمایا کہ وہ بازار سے باہر جاکر چھوٹے تاجروں اور کاشتکاروں سے سارا مال سستے داموں خرید لیں۔

عن ابن عباس رضی الله عنہما قال:قال رسول الله ﷺ لا تتلقوا الركبان۔

(متفق علیہ)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (بیرونی) تجارتی قافلوں سے (باہر جاکر مال خریدنے کے لیے) نہ ملو، (بلکہ انہیں بازار تک براہ راست رسائی دو۔)

عن ابن عمر رضی الله عنہما قال: قال رسول الله ﷺ لا تتلقوا السلع حتى يهبط بها الى الاسواق۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تجارتی قافلوں سے سامان خریدنے نہ ملو یہاں تک وہ سامان بازاروں میں براہ راست (بیچنے کے واسطے) اتارا جائے۔

کیونکہ جب چھوٹا تاجر براہ راست منڈی آتا ہے تو اپنے محدود وسائل تجارت کے پیش نظر لمبی منصوبہ بندی کی بجائے اس بات کا متمنی ہوتا ہے کہ اس کا مال جلد بک جائے، اس لیے وہ مناسب نفع رکھ کر بیچتا ہے، لیکن جب بڑا تاجر اور آڑھتی اس سے سارا مال سستے داموں لے لیں تو ایک وہ مالدار اس کا کچھ نفع کھا جاتے ہیں، دوسری طرف ذخیرہ کرکے عوام کو مہنگے داموں بیچتے ہیں، لہذا عوام کو بھی اچھا خاصا نقصان ہوتا ہے۔ آپ کے اس معاشی اصلاح نے مافیا کا راستہ روکا، کیونکہ بڑے تاجر کو اگر چیز کی آزادی مل جائے تو وہ مافیا بن جاتا ہے، ساری اشیاء اپنے قبضہ میں لے کر مارکیٹ میں من مانی قائم کر دیتا ہے۔ آج عالمی سطح پر چند ہی بڑی کمپنیاں ہیں، جب دنیا میں کسی کمپنی کا کوئی بھی کاروبار پنپتا ہے تو وہ آگے بڑھ کر اس کو خرید لیتی ہیں، اس وجہ سے عالمی مارکیٹ پر ان کی غنڈہ گردی قائم ہیں، وہ

من مانی قیمتیں قائم کرتی ہے اور جس طرح چاہتی ہیں سرمایہ لوٹتی ہیں، وہ اپنا پروڈکٹ سمندر برد کرنا گوارا کر لیتی ہے لیکن اسے انسانیت کی سہولت کے لیے سستا فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ اس ایک نبوی ارشاد کو فراموش کرنے کا وبال ہے۔

(۳) آپ ﷺ نے ذخیرہ اندوزی کی ممانعت فرمائی اور مال ذخیرہ کر کے بحران پیدا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔ کیونکہ احتکار اور ذخیرہ اندوزی سے سرمایہ چند ہاتھوں میں سمٹ جاتا ہے جبکہ اسلام دولت کی گردش کا قائل ہے۔ مزید ذخیرہ اندوزی سے مصنوعی بحران جنم لیتے ہیں، سامان زندگی کی بہتات ہوتی ہے، لیکن وہ چند ہاتھوں میں محبوس ہوتا ہے اور گوداموں میں سڑ رہا ہوتا ہے لیکن مصنوعی بحران اس لیے پیدا کیا جاتا ہے تاکہ طلب میں اضافہ ہو اور اس طرح قیمتیں بڑھیں۔ آج کی معیشت میں جہاں غذائی قلت کا نعرہ بلند ہوتا ہے عموماً وہاں کوئی قلت نہیں ہوتی بلکہ ایسے عالمی ساہوکاروں نے اپنے پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے مال ذخیرہ کر کے مصنوعی بحران پیدا کیے ہوتے ہیں۔

(۴) آپ ﷺ نے ایسی چیز جس کا ابھی وجود نہ ہو بیچنے سے منع فرمایا کیونکہ یہ غرر اور سٹہ کی بنیاد ہے، نیز آپ نے ایسی چیز جو مالک کی ملکیت نہ ہو اسے بھی بیچنے سے منع فرمایا کہ یہ غرر ہی کی صورت ہے، اسی طرح آپ نے اپنی چیز بھی قبضہ میں آنے سے پہلے فروخت کرنا ممنوع قرار دیا، کیونکہ عموماً لوگ غیر موجود چیز یا قبضہ میں آنے سے قبل ہی چیز ہاتھ در ہاتھ بیچتے خریدتے ہیں اور ایک ہی مجلس میں اس کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اور جب وہ حقیقی معنوں میں مارکیٹ میں دستیاب ہوتی ہے تو چند سرمایہ داروں کے بے تحاشا نفع خوری نے اس کی قیمت عام خریدار کے دسترس سے باہر کر دی ہوتی ہے۔

(۵) آپ ﷺ نے ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، دھوکہ، غرر، سٹہ، جوا، قمار، مبیع کے عیب چھپانے، مجبور کا استحصال کرنے اور تجارت میں قسمیں کرنے سے منع فرمایا، خیار شرط، خیار عیب، خیار رویت اور خیار تعیین کے ذریعے بیچنے اور خریدنے والے کو تحفظ دیا، مال واپس کرنے پر اجر وثواب کی فضیلتیں سنائیں۔ اس طرح تجارت کو وہ مضبوط اخلاقی بنیادیں فراہم کیں، جہاں تجارت کا مقصد محض

کمائی اور سرمایہ میں اضافہ نہ تھا بلکہ اپنی اور مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرنا پیش نظر ہوتا تھا۔ اس سے ایک ایسا معاشی معاشرہ وجود میں آیا جو سرمایہ کے حصول کے لیے باہمی رسہ کشی اور رقیبانہ جذبات سے مکمل پاک تھا اور ایک دوسرے کی تجارتیں ناکام کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو بڑھوتری دینے کی فکر کی جاتی تھی۔

(۶) آپ ﷺ نے انسان کی نجی ملکیت سے بہت ساری چیزوں کو خارج فرما کر انہیں وقف عام کر دیا کہ جس سے ہر انسان مساوی فائدہ اٹھانے کا حق دار ہے اور وہ انفرادی ملکیت میں نہیں دی جا سکتیں۔ ان چیزوں میں آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خودرو گھاس، جنگل اور پانی، معادن (کانیں) غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ شامل ہیں، ان میں بعض چیزوں کے استعمال کا حق دار ہر شخص ہے اور بعض اشیاء سے اسلامی مملکت کے امیر کے حکم کے مصالح عامہ کو پیش نظر رکھ کر استفادہ کیا جائے گا۔

معادن میں فقہا کی تصریح کے مطابق نمک، گندھک، تارکول، تیل، سرمہ، یاقوت وغیرہ جیسی دھاتیں شامل ہیں گویا اگر کوئی شخص اسے نجی طور پر آباد بھی کرے تب بھی اس کا مالک نہیں ہو سکتا۔

(۷) آپ ﷺ نے کئی آمدنیوں کو قطعاً حرام و باطل قرار دے دیا۔ مثلاً خنزیر، مردار، خون وغیرہ کی خرید و فروخت اور باطل طریقوں سے مال کی افزائش۔ ان باطل طریقوں میں سرفہرست سود کا ہر قسم کا کاروبار ہے جس کے جزو کل کو اسلام نے حرام قرار دے دیا اور سود خور کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسول اللہ ﷺ سے جنگ کا چیلنج دے دیا۔ سود کی بربادیوں کا احساس، ہر منصف مزاج معاشی سمجھ رکھنے والا شخص کر سکتا ہے۔ حاجت مند اور محتاج کو جس طرح یہ لوٹتا ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ چالیس سال میں اگر پانچ فیصد شرح سود ہو تو سود مفرد میں محتاج سے یہ سود کی بجائے تین سو اور مرکب سود میں سات سو وصول کرتا ہے اور شرح سود کی زیادتی و کمی اور اس کے پھیلاؤ کے بقدر اشیاء کی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ بنکاری سود ہی کا کمال ہے کہ پاکستان کی مجموعی دولت کا پچانوے فیصد حصہ چند خاندانوں کے ہاتھ میں سمٹ آیا اور ابھی ھَلْ مِنْ مَزِیْد کی صدا مسلسل جاری ہے۔ قمار، جوئے، ہر صورت سٹہ بازی جس سے تاجر کروڑوں کے

وارے نیارے کرتے ہیں اور پل بھر میں امیر بنادینے والے ہر داؤ کو حرام کر دیا۔ رشوت، لوٹ کھسوٹ اور ہر قسم کے جبر و اکراہ سے حاصل کردہ مال کو ناجائز بنادیا۔ گویا ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام کی ان تمام بنیادوں کو اکھاڑ دیا جس سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جاتا ہے۔ تجارت میں بھی دھوکہ، فریب یا ظلم و زیادتی کی ممکنہ راہوں کو بند کرنے کے لئے تجارت کی کئی صورتوں کو حرام قرار دے دیا۔

(۸) آپ ﷺ نے کرنسیوں کے باہمی فروخت میں مجلس کے اندر قبضہ ضروری قرار دیا اور اس کی خلاف ورزی سود کی ایک شکل ٹھہری، کیونکہ اسی سے سٹہ کی راہ کھلتی ہے۔ آج دنیا میں ڈیجیٹل کرنسیوں کے نام پر جو کرنسیوں کے باہمی تبادلے اور کاروبار کا ایک طوفان مچا ہوا ہے، وہ اسی سود خوری کی بدترین شکل ہے، جس سے سرکار دوعالم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

(۹) آپ ﷺ نے جاہلی عرب میں رائج خرید و فروخت کی وہ تمام شکلیں ممنوع قرار دیں، جن میں ذرا بھر بھی بائع، مشتری یا مبیع کا نقصان ہوتا تھا، اسی طرح غیر یقینی صورتحال پر مبنی خرید و فروخت نیز حصول مال کی ایسی شکلیں جس میں رسک نہ لینا پڑے ممنوع قرار دیں۔ کیونکہ یہ ساری چیزیں دولت کے ارتکاز، جوئے، قمار اور دھوکہ دہی کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔

(۱۰) آپ ﷺ نے آمدن کے ذرائع کے محدود کرنے کے علاوہ اخراجات کی راہ کشادہ کر دی اور قانوناً 'دین' بنا کر مال کی تقسیم کے طریقہ مقرر کر دیئے۔ جس سے مال چند اشخاص کی بجائے پورے معاشرے میں پھیلتا جاتا ہے اور غریب کی حاجات اس طرح پوری ہو جاتی ہیں کہ وہ خود تونگر اور مالدار بن جاتا ہے۔ مولانا اشرف سلیمانیؒ ان میں سے بڑی بڑی مدات کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> زکوۃ: سونے چاندی اور تجارتی مال کے اصل پر ڈھائی فیصد سالانہ کے حساب سے مفلس اور ناداروں کے لئے ان کا حق قرار دے کر جو مال نکالا جاتا ہے۔ اسے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ افلاس کو ختم کر دینے میں زکوٰۃ کا اتنا عظیم اثر ہے کہ اگر چند سال کے لئے یہ نظام قائم ہو جائے تو کوئی نادار نہ رہے۔ مالدار اگر کوئی کروڑوں ٹن سونے کا مالک ہو اور

کسی جائز تجارت میں سرمایہ کو نہ لگائے تو اس کا تقریباً سارا سرمایہ چالیس سال میں غریب اور نادار کی جیب میں چلا جائے گا۔ مال کی طرح زمین سے نکلنے والی ہر پیداوار پھل، سبزی، ترکاری، اناج اور کپاس وغیرہ پر دسواں یا بیسواں حصہ غریب کا حق ہے۔ قرآن کہتا یہ ہے:

﴿فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ۔ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ﴾. (المعارج:۲۵،۲۴)

ترجمہ: ان کے اموال میں مانگنے والے اور محتاج کا حق ہے۔

اگر مصنوعی ذرائع سے کاشت ہے تو بیسواں حصہ غریب کا مال ہے ورنہ دسواں حصہ۔ اسی طرح چوپایوں اونٹ بھیڑ، بکری، گائے، بھینس وغیرہ پر بھی زکوٰۃ ہے۔ جس پر رسول انور ﷺ کے زمانے کے لکھے ہوئے احکام و فرائض اب تک موجود ہیں۔

دفینوں اور معدنیات کی آمدن کا پانچواں حصہ ناداروں اور غریبوں کا حق ہے۔ اس کے علاوہ صدقۂ فطر، کفارات وغیرہ کی کئی آمدنیاں غرباء اور ناداروں پر تقسیم ہوں گی۔ حضور انور ﷺ کا ارشاد ہے:

"تو خذ من اغنیاء هم وترد علیٰ فقراءهم".

ان کے امیروں سے لے کر یہ زکوٰۃ اور اس قسم کی دیگر مدات کی رقمیں فقراء میں تقسیم ہوں گی۔

یہ رقم بیت المال میں جمع ہو کر انہیں "مصارف" میں صرف کی جائیں گی، جن کی قرآن نے تصریح کی ہے۔ بیت المال سے حاجت مندوں کی ضرورت کے وقت اس رقم سے قرضہ وغیرہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ اجتماعی خزانہ ہے جو ہر فرد کی ضرورت کے وقت میں کفالت کرتا ہے اور مصنوعی اور ناجائز بیموں اور سودی کاروبار سے انسان کو بچاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہر شیر خوار بچہ کو بیت المال سے دو سو درہم ماہوار وظیفہ دیا جاتا

تھا اور بڑوں کے مختلف حیثیتوں سے وظائف مقرر تھے۔ یہ بیت المال ہر شخص کی روٹی، کپڑا، صحت و مسکن اور دیگر ضروریات کا ضامن ہے۔

اسلام کا قانون میراث بھی تقسیم دولت میں بڑا اہم کردار انجام دیتا ہے۔ بڑی بڑی جائز زمینداریاں بھی دو تین نسلوں یعنی پچاس، ساٹھ سال میں تقسیم کے عمل سے ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

زمینوں کے ناجائز عطیات کی کوئی شرعی حیثیت نہیں، ہمارے ملک میں اکثر جاگیریں اس کے ذیل میں آجاتی ہیں، غیر آباد زمینیں آباد کرنے والے کا حق ہے۔ زمیندار پر لازم ہے کہ کاشتکار کے حقوق کی رعایت کرے اور کاشتکار کی اجیر کی حیثیت ہے، جس پر لازم ہے کہ مالک کا حق پورا ادا کرے۔ اسلام نے آجر اور اجیر، سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار کا تعلق "طلب و رسد" کی بنا پر قائم نہیں کیا، بلکہ بھائی چارے کی اسلامی بنیادوں پر اٹھایا ہے۔ فرمایا ہے: جو خود کھائو اس کو کھلائو جو خود پہنو اسے پہنائو۔ اسے برے لقب سے عبد "غلام" کہہ کر نہ پکارو۔ بلکہ اسے بھائی کہہ کر خطاب کرو۔ قانونی دفعات کے علاوہ اسلام نے اخلاقی لحاظ سے صدقہ، خیرات اور انفاق پر اس قدر زور دیا ہے کہ بعض اسلامی محققین نے اسلامی نظریہ معاش کو نرا انفاقی نظریہ معاش قرار دیا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ صحابہ یہ خود بھوکے رہ کر اوروں کو کھلا دیتے تھے۔ خود حضور انور ﷺ کی دہش کا یہ حال تھا کہ جب ایک سائل کے سوال پر اسے بھیڑ، بکریوں کا ایک ریوڑ دے دیا تو وہ بے اختیار پکار اٹھا: اے لوگو! اسلام لے آؤ۔ محمد ﷺ اتنا دیتے ہیں کہ اس کے بعد ناداری کا خوف نہیں رہتا۔ (مقالات اشرف، ج:۱، ص:۲۶۶، ۲۶۵)

ان کے علاوہ بھی وقف، قرض حسنہ، صدقہ فطر، قربانی، کفارات، ہدیہ، ہبہ، منیحہ، صدقہ، ضیافت، کفالت وغیرہ کے عنوان سے بعض اوقات وجوبی اور بعض اوقات استحبابی و اخلاقی مدات ایسے قائم فرمائے، جس سے مال کی گردش قائم رہے اور مال داروں کے مال کا معتد بہ حصہ فقراء اور معاشرہ

کے کہتر طبقات تک پہنچتا رہے۔

نوجوانوں میں معاشی تحریک

نوجوانوں کو معاشرے کے دیگر طبقات پر تکیہ کرنے کی بجائے خود ان میں معاشی تحریک پیدا کرنا بھی آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ کتب حدیث میں بیع من یزید؟ یا بیع المزایدۃ یعنی نیلامی کے عنوان کے تحت عموماً یہ حدیث ذکر کی جاتی ہے کہ ایک کسمپرس و تہی دست صحابی اپنی معاشی ابتری و قلاشی کا دکھڑا سنانے دربار رسالت حاضر ہوئے اور مدد کی درخواست بھی کی تو آنحضرت ﷺ نے استفسار فرمایا کہ تیرے پاس کچھ ہے؟ اس نے ایک پیالے اور کمبل کا ذکر کیا جسے آپ ﷺ نے منگوا کر دو درہم میں نیلام کروایا۔(ترمذی)

پھر رقم کے استعمال کے سلسلے میں اسے ہدایات دیں کہ ایک درہم سے گھر کی فوری کھانے پینے کی ضرورت پوری کریں اور دوسرے درہم سے کلہاڑا اور رسی خرید کر پہاڑ سے لکڑیاں لا کر بازار میں بیچے ، اس ترتیب پر اس صحابی نے بھرپور محنت کی جس سے کچھ عرصہ میں حیران کن نتائج بر آمد ہوئے اور ان کی معاشی حالت سدھر گئی۔ اس حدیث پر غور کرنے سے کئی پہلو سمجھ آتے ہیں۔

۱۔ سیاسی قیادت کی مردم شناسی ایسی ہو کہ شخصیت کو ایک نظر میں پرکھ لے کہ یہ معاشرے کا مفید اور باروزگار فرد بن سکتا ہے لہٰذا اسے سوالی بنانے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی ضرورت ہے۔ نوجوانوں کو مفت کی خیرات دینے کی بجائے روزگار کے مواقع مہیا کرنا اسوۂ نبوی ہے اور یہی کامیاب و مستحکم معیشت کی کلید ہے۔

۲۔ حضور ﷺ اسے وسیلۂ روزگار دینے کے واسطے صحابہ سے بھی چندہ اکٹھا کر سکتے تھے لیکن اس کا اپنا مال استعمال کروایا کیونکہ کاروبار کی مفت بنیادیں وہ تحریک پیدا نہیں کرتیں جو اپنا سرمایہ لگنے پر پیدا ہوتی ہے۔ یہی ایک نکتہ سوشلزم کی ساری بنیاد ڈھا دیتا ہے، جہاں سب کچھ حکومت کی ملکیت ہوتی ہے، فرد کا اپنا سرمایہ نہیں ہوتا، اس لیے اس کو معاشی تحریک میں دلچسپی بھی نہیں ہوتی۔

۳۔ حضور ﷺ نے اس صحابی کا سارا مال بکوا دیا، کچھ باقی نہ چھوڑا۔ اس لیے کہتے ہیں کہ

زبردست اور منصفانہ معاشی تحریک رسک کی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ جہاں رسک نہ ہو وہاں تن من کی بازی نہیں لگتی اور بھرپور نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ سرمایہ دارانہ نظام جس آمدنی کی بنیادیں دیتا ہے اس میں رسک نہیں نفع ہی نفع ہے، اس لیے آج ہمارے نوجوان شارٹ کٹ لگا کر بغیر کچھ رسک لیے اور بغیر محنت و مشقت کے پیسہ کمانا چاہتے ہیں جو اسلام کے نظم معیشت کے منافی ہے۔

۴۔ عام وسائل روزگار تلاشنے کے لیے اپنے دستیاب وسائل کی جانچ ضروری ہوتی ہے۔ بسا اوقات دستیاب وسائل سے روزگار کی راہیں نکل آتی ہیں۔ ہم وسائل ڈھونڈھنے کے لیے خجل خوار ہوتے ہیں حالانکہ گھر میں اتنا کچھ فراہم ہو سکتا ہے جسے کام میں لا کر ایک وسیلۂ روزگار تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ سٹیٹس کے چکر میں دستیاب وسائل کو کام میں نہ لانے کا مرض سرمایہ دارانہ نظام کا تحفہ ہے جو سمِ قاتل ہے۔ آپ ﷺ نے صحابی کو اپنے دستیاب وسائل سے معاشی تحریک پیدا کرنے پر لگایا۔

۵۔ بعض اوقات ایک شخص روزگار کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس کے پاس Idea (منصوبہ) نہیں ہوتا۔ مشورہ دینا معاشی مسئلہ کا آدھا حل ہے۔ صحابی کے پاس صلاحیت تھی منصوبہ نہیں تھا۔ مشورہ فراہم کرنا سنت نبوی ہے۔

۶۔ محض Theoretical Ideas (نظری منصوبے) آج کل کے کیریئر کاؤنسلنگ کا مغربی طریقہ ہے۔ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا مشکل کام ہے۔ آج ہر موٹیویشنل اسپیکر سکرین پر بیٹھ کر سبز باغ دکھاتا رہتا ہے لیکن وہ صرف نظری باتیں ہوتی ہیں، عملاً میدان میں کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے اور اس کے امکانات کیا ہے؟ یہ حل کسی کے پاس نہیں۔ حضور ﷺ نے صرف نظری منصوبہ نہیں دیا بلکہ اسے عملی بنیادوں پر قائم کر کے صحابی کو میدان میں اتارا۔

۷۔ بعض اوقات ایک شخص اپنی کسمپرسی کے باعث Moral support (حوصلہ افزائی) کا محتاج ہوتا ہے۔ اپنی وجاہت استعمال کر کے اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ اگر یہ صحابی کمبل و پیالہ خود بیچتے تو شاید نہ بکتا، یا کم قیمت بکتا، لیکن حضور پُر نور ﷺ کے دست مبارک لگنے اور پھر خود نیلامی کے لیے پیش کرنے پر ظاہر ہے کہ خریدنے والوں کی دلچسپی اس میں بڑھی جس سے بیچنے والے کو مدد

ملی۔ سیاسی قیادت سے آج نوجوانوں کو یہی حوصلہ افزائی درکار ہے۔

۸۔ دوراندیش قیادت کی رہنمائی یا لائحۂ عمل بعض اوقات نتیجہ خیز دکھائی نہیں دیتا، نہ اس کا انجام کار واضح ہوتا ہے لیکن اگر قیادت مخلص ہو اور کارکن ورعایا کو اس پر اعتماد ہو اور اس کی پالیسی پر من و عن عمل پیرا ہو تو نتائج ضرور نکلتے ہیں، اس کے لیے ہمتِ باطنی اور اعتقاد و انقیاد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ صحابی کے لیے کل اثاثۂ زندگی نیلام کرنا ایک ایسے روزگار کے لیے جس کا کوئی انجام معلوم نہیں آسان نہ ہو گا لیکن وہ ارشاد رسالت پر آمادہ ہوئے ہمت دکھائی تو نتائج ملنا شروع ہوئے۔

۹۔ عام وسائل روزگار اور دیسی پیشے روزمرہ ضروریات کی کفایت کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ بڑا کاروبار ہی ملے۔ عام وسائل روزگار اور پیشے اختیار کر کے بھی پاؤں پر کھڑا ہونا ممکن ہے۔ آج نئی نسل کو یہ سمجھانا ازحد ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر معاشی خود کفالتی پیدا نہیں ہو سکتی، ہمارے ہاں تعلیم کے نام پر حکومت کے چند محدود اداروں میں ملازمتوں کے لیے مشینری تیار کی جاتی ہے۔ حکومتیں نسل نو میں عام وسائل روزگار اور دیسی پیشوں یا چھوٹی صنعتوں اور زراعت کے ذریعے معاشی تحریک پیدا کرنے کی کوئی منصوبہ بندی نہیں رکھتی ہیں، اس کا نقصان یہ ہے کہ بڑی کھیپ ڈگریاں لے کر بے روزگاری کا شکار ہے حالانکہ ان کی رہنمائی کر کے اور کچھ وسائل بہم پہنچا کر عام روزگاروں سے باآسانی جوڑا سکتا ہے۔

۱۰۔ مذکور حدیث سے ایک اہم سماجی نکتہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ معاشرے کے قلاش و تہی دست طبقات کو صرف حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی بنیاد پر کس طرح کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ مسائل سن کر دکھ درد میں صرف سر دھننا قیادت کا کمال نہیں کہلایا جا سکتا بلکہ زاویۂ نظر بدل کر ناممکن سے ممکن کی راہیں نکالنا رجالِ کار کا شیوہ ہوتا ہے۔ آج ہماری نئی نسل معاشی تنگ دستی کے باعث نفسیاتی امراض کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ حالانکہ اضطراب یعنی Tension اور اضمحلال یعنی Depression وقتی تنگ دستی اور حالات سے طاری ہونے والے ایسے امراض ہیں جنہیں طبی علاج سے زیادہ ایک ماہر

نفسیات کی رہنمائی سے دور کرنا آسان ہوتا ہے۔ ان دونوں امراض کا ازالہ مذکورہ حدیث کی روشنی میں "مایوسی کے حال" سے نکالنے کے بعد ہی ممکن ہیں اور اس کے لیے سیاسی قیادتوں کو اسی منہج پر چلنا چاہیے، جس پر حضور اقدس ﷺ نے ایک نوجوان صحابی کو ڈالا۔

معاشی وسائل سے برتے جانے والے منفی رویے اور ان کا علاج

ایک نظم اجتماعی میں دستیاب وسائل کو اس طور پر استعمال کرنا کہ مسائل پوری حل ہوں ایک کامیاب معیشت کی علامت ہوتی ہے، مسائل زیادہ ہوں اور وسائل کم تو وہاں ترجیحات کا تعین گہری بصیرت کا متقاضی ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے قرآنی ہدایات کی روشنی میں معاشی وسائل کے بارے میں بڑے ٹھوس تعلیمات ارشاد فرمائے اور ان کے ساتھ برتے جانے والے منفی رویوں کی نشان دہی کر کے ان کا علاج تجویز کیا ہے تاکہ انسانیت کو معاشی بگاڑ اور معاشی وسائل کے استحصال سے بچایا جا سکے۔ قرآن مجید و سنت نبوی نے معاشی وسائل سے متعلق اساسی طور پر چار انسانی رویوں کی نشان دہی کی ہے:

پہلے رویے کو قرآن مجید نے "بخل وشُح" سے تعبیر کیا ہے۔

دوسرے رویے کے لئے "اسراف و تبذیر" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

جب کہ تیسرے رویے کو اتراف کہا ہے۔

اور چوتھے رویے کو "اقتصاد" اور "انفاق" کہا ہے۔

اسلام نے ان میں سے پہلے تین رویوں کو منفی قرار دے کر ان کی خوب مذمت کی ہے، اپنے پیروؤں کو ان سے بچنے کی تاکید کی ہے اور اس کے لیے ترغیب وترہیب ہر دو پہلوؤں سے کام لیا ہے، جبکہ چوتھے رویے کو محمود و مطلوب بتلایا ہے اور اسے برتنے پر دنیا و آخرت کے انعامات کے وعدے کیے ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ اسلام کی نظر میں معاشی وسائل میں بگاڑ اور فساد کی بنیاد پہلے تین رویے ہیں اور چوتھا رویہ ہی اس بگاڑ کی اصلاح کا کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے، لہٰذا ذیل میں ان منفی رویوں کے نقصانات کا جائزہ لیتے

ہیں۔

بخل وشُح :

اسلام نے مال کی محبتِ عقلی کو برائی کی جڑ قرار دیا ہے۔ ''بخل وشح'' کا رویہ حب ِمال کا مظہر ہے۔ بخل اپنے ذاتی سرمایے سے واجب اخراجات کو روکنے اور مقام مروت میں خرچ سے پہلو تہی کا نام ہے۔ قرآن مجید نے تنبیہ کی ہے کہ مال بچانے کی یہ روش شر کا پیش خیمہ ہے، اسے جو لوگ اپنی معاشی ترقی کا سبب تصور کرتے ہیں وہ دھوکے میں ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ (اٰل عمران:۱۸۰)

(ترجمہ) اور وہ لوگ جو اس چیز (کے خرچ کرنے) میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت سے انہیں دے رکھی ہے، وہ خیال نہ کریں کہ (یہ بخل) ان کے لئے بہتر ہے بلکہ یہ ان کے لئے بہت برا ہے، جس (مال) میں وہ (آج) کنجوسی کر رہے ہیں یقیناً قیامت کے دن اسی کے طوق ان کے (گلوں میں) ڈالے جائیں گے۔''

احادیث مبارکہ میں بخل کو کفار کا شیوہ، دین بیزاری، خبثِ باطن اور جہنم کے عذاب کا سبب قرار دیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ حضور ﷺ اس رویے سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

بخل سے قریب تر رویہ شُح ہے۔ شح اس باطنی بیماری کا نام ہے کہ انسان اپنے مالی وسائل سے کبھی سیر نہ ہو اور وہ اپنی پوری توانائی اس پر صرف کردے کہ کسی طرح دوسروں کے مالی وسائل اس کے قبضہ میں آجائیں۔ یہ حرص وآز اور طمع وخود غرضی کی ایک جامع شکل ہے۔ قرآن مجید نے واضح کیا ہے کہ حقیقی کامیابی سے وہی شخص ہمکنار ہو سکتا ہے جو شح کے رویے سے پوری طرح پاک ہو، لہٰذا جذبہ شح سے مغلوب شخص یا سماج وحکومت

اسلام کی نظر میں ایک طاغوت ہے کیونکہ شح وہ رویہ ہے جو انسان کو ہوس ِمال اور حرص ِاقتدار کی راہ سجھاتا ہے اور اسے ظلم و تعدی پر آمادہ کرتا ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے :

واتقوا الشح فان الشح یھلک من کان قبلکم، حملھم علیٰ ان سفکوا دمائھم واستحلوا محارمھم (رواہ مسلم)

(ترجمہ) شح سے بچو، پس بے شک شح نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا، انہیں خون بہانے اور عزتیں پامال کرنے پر برانگیختہ کیا۔

شح کے اس مختصر تجزیہ سے واضح ہوتاہے کہ آج ترقی یافتہ اورمہذب کہلانے والے انسانی معاشروں اور ریاستوں میں اپنی دولت وثروت بڑھانے کے لئے جاری رسہ کشی اورمکروہ اقدامات کے پیچھے یہی جذبہ کارفرماہے، مثلاً:

۱۔شح کی باطنی بیماری کے بسبب معیشت وتجارت کے نام پرسٹہ، لاٹری، قمار اور غرر کی گرم بازاری ہے اور اس عنوان سے بے تحاشا دولت لوٹی جارہی ہے۔

۲۔ھل من مزید کے اس نظریے نے سودکی مختلف شکلوں کو رواج دے کر اللہ و رسول سے اعلانیہ جنگ کے دروازے کھولے ہیں۔سود کا ایک ذرہ کھانا اپنی ماں کے ساتھ چھتیس مرتبہ بدکاری سے بدتر بتلایا گیا، اور اس میں ملوث ہر فرد پر لعنت کی گئی ہے۔

۳۔زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی سوچ نے محض مالی نفع کے لئے نشہ آور، مضرِ صحت اور مخربِ اخلاق چیزوں کے وسیع پیمانے پر کاروبار بلکہ مالی وسائل میں اضافے کے لئے عزت و آبرواور جسم تک کی سودے بازی کو جواز بخشاہے۔عصری معاشی نظاموں میں رویہ شح کے حاملین نے انسان کوتمام خدائی اور اخلاقی پابندیوں سے بغاوت پرآمادہ کرکے اسے یہ راستہ سجھایاہے کہ وہ معاشرے کا ترقی یافتہ فرد تبھی کہلا سکتا ہے جب وہ اپنے مالی وسائل میں اضافہ کرے چاہے یہ سنیماکھول کر ممکن ہو، نیم برہنگی کے ساتھ فلمیں بنانے، طوائف بننے یا ہیروئن اور شراب کا کاروبار کر کے ممکن ہو، بس مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے

زیادہ مال بٹورا جائے۔

۴۔آج عالمی سطح پر احتکار و ادخار کے ذریعے پیدا کردہ مصنوعی بحران بھی اس رویے کا نتیجہ ہیں۔ دنیا کی بڑی آبادی پانی کو ترس رہی ہے لیکن منرل واٹر کی لاکھوں بوتلیں اس لیے سمندر برد ہو رہی ہیں کہ ان کی مارکیٹ ویلیو میں کمی نہ آئے اوران کی طلب، ہر حال میں رسد سے زیادہ رہے۔ بچے بنیادی خوراک اور دودھ کی کمی کے باعث مر رہے ہیں جبکہ نیسلے کے خوراکی پیکٹس اور دودھ کے ڈبے سمندری آلودگی کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ یہ شح کے رویے کے مظاہر ہیں جس نے انسان کو حیوانوں سے بدتر بنا دیا ہے۔

۵۔صحت و تعلیم جیسی بنیادی ضروریات کو بھی اس رویے کے حاملین نے نفع بخش صنعت کی شکل دے دی ہے اور ان پر مال بٹورنے کی روش اب کوئی عیب نہیں بلکہ بہت بڑا کمال اور معاشرے پر احسان تصور ہوتا ہے۔

۶۔ان تمام مفاسد سے بڑھ کر کمزوراور ترقی پذیر ملکوں کے وسائل لوٹنے اور ہتھیانے کے لئے بدامنی کی خاکہ سازیاں، لوگوں کے معاشی استیصال پر مبنی نظاموں کی تشکیل، ان پر جنگوں کی تسلیط اور معاشی پابندیاں اسی رویے کے نمو اور ارتقا کے مظاہر ہیں۔ جن سے خطۂ ارضی کا امن و سکون تباہ اور انسانی معاشرہ اپنے بگاڑ کی انتہائی حدوں کو چھو رہا ہے۔

اسراف و تبذیر:

معیشت کے بگاڑ میں اسراف وتبذیر کا کردار بھی کچھ کم نہیں، جب شح کے رویے نے انسان کو زیادہ سے زیادہ مالی و سائل کی بڑھوتری کے لئے ہمہ قسم بندشوں سے آزاد کر دیا تو اس رویے کے حاملین نے انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنی مصنوعات کو دنیا میں اس انداز سے پھیلایا کہ ان کی موجودگی میں کسی اور کو پنپنے کا موقع نہ مل سکے اور لوگ انہی سے مال خریدنے پر مجبور ہوں۔

دوسری طرف انہوں نے انسان کی فطری کمزوری یعنی خواہشِ نفس کو ابھارنے کی

اشتہار بازی کے ذریعے پوری منصوبہ بندی کی اوراس کی فکروسوچ کواس سطح پرلایاکہ وہ روزمرہ ضروریات کی تکمیل کے لیے ضرورت کی بجائے سہولت وآسائش بلکہ اس سے آگے بڑھ کرنمائش اور تعیش کو ترجیح دے جیسا کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کا طرزِ عمل واضح ہے۔اس سے ہماری ثقافت اور کلچرمیں بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں۔پہلے لوگ موچی سے جوتے بنواتے تھے جو سال ہا سال استعمال ہوتے تھے، اب ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مہنگے، نمائشی، بنے بنائے جوتوں کا رواج ہو چلا ہے، مزید یہ کہ ہر مہینے نیا ڈیزائن آ رہا ہے اور انسانی فطرت اور خواہشِ نفس قناعت کو پرے پھینک کر کُلُ جَدِیدٍ لَذِیذٌ (ہر نئی چیز لذیذ ہوتی ہے) کے تحت اسے حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ہماری ثقافت سے درزی ختم ہوتا جارہا ہے اور ان کمپنیوں کے ریڈی میڈ لباس نے انسان کو خواہش کا پجاری اور تن آسان بنا دیا ہے۔ کبھی گوالا بھی ہماری ثقافت کا حصہ تھا، اب شہروں میں تو وہ ڈھونڈے سے نہیں ملتا، ملٹی نیشنل کمپنیوں کا بدذائقہ اور مضرِ صحت دودھ بڑے شوق سے خریدا اور استعمال کیا جا رہاہے۔ان دودھوں میں سے اکثر سرے سے دودھ ہی نہیں بلکہ مختلف کیمیکل چیزوں کا مجموعہ ہیں۔ ہماری ذہنی پستی کا اندازہ لگائیں کہ قدرتی دودھ کو جراثیم زدہ اور کیمیکل سے آلودہ ڈبوں کو آبِ حیات باور کرایا جا رہا ہے۔اب وہ دور بھی گیا کہ گھر کی خواتین بیٹھ کر اونی دھاگوں سے سویٹر بن لیں، یا مرچیں کوٹ کر دیسی مصالحہ بنا لیں، اب تو ملٹی نیشنل کمپنیوں کا راج ہے اور یہ ساری چیزیں انتہائی ناقص، ہم سے دس گنا زیادہ قیمت وصول کر کے صرف چمکیلی پیکنگ میں ہمیں دے دی جاتی ہیں۔

رویہ شخ ہی کے حاملین کا یہ وہ گھناؤنا وار ہے کہ مال ہتھیانے کے واسطے اسراف و تبذیر اور عدم قناعت کے کلچر کو فروغ دیا جائے۔ آج معاشرے کو غربت کے جس عفریت نے گھیر رکھا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام آدمی کو اشیائے ضرورت اصل قیمت پر مہیا نہیں اور وہ نمائش کے جملہ اخراجات برداشت کر کے ہی اسے حاصل کر سکتا ہے حتیٰ

کہ صابن کی ٹکیہ خریدنے والے پر بھی اس کی عمدہ اور مہنگی پیکنگ، لاکھوں کے اشتہارات اور اس کی نمائش کرنے والی ماڈل گرلز کی فیسوں کا بوجھ آپڑتا ہے ا ور اس جرعہ زہر آب کے بغیر وہ ضرورت کی تکمیل نہیں کر پاتا۔یہی حال تقریباً ساری ملکی و غیر ملکی مصنوعات کا ہے۔

اسلام نے تکمیل ضرورت میں قناعت وسہولت کے درجے کو جائز کہا ہے،اس کے بعد آسائش کو گوروا ومباح رکھا ہے لیکن اس سے قناعت افضل بتلائی ہے اور ''نمائش'' کے درجہ کو اسراف ٹھہرا کر اس سے بچنے کی تلقین کی ہے کیونکہ اس کی کوکھ سے وسیع پیمانے پر غربت جنم لیتی ہے۔ آج سیاسی قائدین اور امت کے اہل حل وعقد میں اگر سادگی، قناعت اور اقتصاد کی ثقافت فروغ پائے اور اسراف وتبذیر کے جو نمونے کنگھال اور مقروض ممالک میں ان کے ہاتھوں سامنے آرہے ہیں،اس کا روک تھام ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ معاشی بحرانوں پر بڑی حد تک قابو پایا جاسکے۔

اسراف کا ایک بڑا درجہ یہ بھی ہے کہ ضرورت سے زیادہ چیزیں بلا مصرف ضائع کر دی جائیں۔ آج گھروں اور ہوٹلوں میں روٹی سالن کے ضیاع سے لے کر عالمی سطح تک قیمتی چیزوں کی پامالی فیشن کی شکل اختیار کر چکی ہے اور اس روگ سے کوئی خال خال ہی بچا ہوا نظر آتا ہے۔

اسراف سے بڑھ کر خطرناک رویہ ''تبذیر'' ہے۔ تبذیر، بذر سے ماخوذ ہے، اس کا معنٰی تخم ریزی کا آتا ہے، کسان جس طرح تخم ریزی کرتے وقت اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ دانہ کھیت میں کہاں گر رہا ہے، اسی طرح ''مبذر'' بھی مال کے خرچ کرنے میں اس شعور سے عاری ہوتا ہے کہ میرے مال کا مصرف حلال ہے یا حرام۔ قرآن مجید نے اس رویے کا نقشہ کھینچتے ہوئے مبذرین کو ''اخوان الشیاطین'' کا لقب دیا ہے، چونکہ شیطانی قویٰ شر و برائی کا سر چشمہ ہوتی ہیں اس لیے تبذیری رویہ بھی انسان کو اپنے مالی وسائل ناجائز

خواہشات کی تکمیل اور غیر قانونی اعمال و افعال پر صرف کرواتا ہے۔ آج ہمارے سیاسی وانتظامی ڈھانچوں میں تبذیری رویے کیسے رچ بس گئے ہیں اس پر کسی دلیل وتوضیح کی حاجت نہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَا تُسۡرِفُوٓاۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلۡمُسۡرِفِينَ (الانعام:۱۴۱)

اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک وہ فضول خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

إِنَّ ٱلۡمُبَذِّرِينَ كَانُوٓاْ إِخۡوَٰنَ ٱلشَّيَٰطِينِۖ وَكَانَ ٱلشَّيۡطَٰنُ لِرَبِّهِۦ كَفُورٗا۔(الاسراء:۲۷)

بے شک فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔

اتراف:

یہ منفی معاشی رویوں میں سب سے بدترین اور سب سے مہلک رویہ ہے۔ یہ تعیش پسندی وتن آسانی کا مجموعہ مرکب ہے۔ مترف انسان خود کوئی ایسی محنت نہیں کرتا جس کا ملک و ملت کو کوئی معاشی فائدہ ہو اور مخلوق خدا اس سے نفع اٹھائے لیکن دوسروں کی محنت کو عیش پرستی اور انتہائی اونچے معیار زندگی پر قربان کر دیتا ہے۔ آج عالمی سطح پر ایسا مترف مزاج طبقہ معاشی نظاموں پر قابض ہو چکا ہے جو سود کے ذریعہ قوموں کو نچوڑ رہا ہے اور اس رقم سے اپنی زندگی کے معیارات کو مسلسل بلند کر کے ترقی کے نام پر اس زمین کو شداد کی جنت بنانے پر تلا ہوا ہے۔ نیز ملکوں اور قوموں کی سیادت وقیادت پر ایسے مترف مزاج اشخاص فائز ہیں جن کی شب وروز کی کاوش مادی زندگی کے معیارات بلند کرنے پر لگی ہوئی ہیں، اس کے لیے وہ اپنے غریب مزدور اور کسان کے خون پسینے سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ لٹا رہے ہیں۔ اپنی عیاشی ومعیار زندگی کی بلندی کے لیے مسلسل قرضے لے کر ملک وملت کے کہتر اور غریب طبقے پر اس کی ادائیگی کا بوجھ ڈالنا اور بھاری ٹیکسوں کے ذریعے ان سے وصولنا ان کی ایسی خوئے بد ہے جس کے رکنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی۔ قرآن مجید نے اس رویہ اتراف کو قوموں کی ہلاکت اور تباہی کا پیش خیمہ بتایا ہے۔ مترفین کی موجودگی میں قوموں کی زندگی سے معاشی بحرانوں کا خاتمہ ناممکن ہوتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔(الاسراء:۱۶)

ترجمہ: اور جب ہم نے کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہا تو ہم نے اس کے خوشحال لوگوں کو حکم بھیجا تو انہوں نے اس میں نافرمانی کی پھر ان پر عذاب کا حکم ثابت ہو گیا، پھر ہم نے انہیں بری طرح ہلاک کر دیا۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا۔(قصص:۵۸)

ترجمہ: اور ہم نے کتنے ہی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جن کو اپنی معیشت پر بڑا ناز تھا۔

معاشرے میں بخل وشح ،اسراف وتبذیر اور اتراف کی اجتماعی نمو سے تقسیم دولت کی ناہمواری، غربت، چوری، ڈاکہ زنی، جوابازی، کرپشن، رشوت خوری، خودکشی، قتل و غارت گری اور بدامنی جیسے مہلک عناصر کو بڑی تیزی سے تقویت ملی ہے اور نجی سطح سے لے کر عالمی سطح تک کے معاشرتی فسادات میں ان معاشی رویوں کا بنیادی کردار ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان رویوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فسادات کا حل یہی ہے کہ "اقتصاد و انفاق فی سبیل اللہ" کو قومی و معاشرتی مزاج جائے اوراس سے معاشی اصلاح اور امت کی فلاح وبہبود میں کام لیا جائے ،اس مزاج پر اٹھنے والے معاشرے میں منفی معاشی رویوں کے حاملین کے کوئی موقع اور جگہ نہیں بچتی اور وہ خود ہی بوریا بستر گول کرنے پو مجبور ہو جاتے ہیں ۔اقتصاد وانفاق کا مطلب دستیاب وسائل کے دائرے میں شرعی حدود کے اندر مسائل کا حل اور ضروریات کی تکمیل اور اضافی وسائل کو انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے اللہ تعالیٰ کے راستے میں عظیم اجر کی امید کے ساتھ خرچ کرنا، تاکہ اس سے آخرت کی منازل آسان ہوں اور وہاں کی فلاح و کامیابی میں یہ وسائل کام آئیں۔ حضوراقدس ﷺ نے خرچ و اخراجات میں اقتصاد کو آدھی معیشت قرار دیااور انفاق پر دنیا وآخرت کی عظیم کامرانیوں کی بشارتیں سنائیں۔ حضرت عبدالرحمن

بن عوف وحضرت عثمان رضی اللہ عنہما جیسی شخصیات نے بخل وشح، اسراف وتبذیر اور اتراف جیسے رویوں سے پاک تجارت ومعیشت کے عملی نمونے امت کے سامنے چھوڑے، وہ مالدار ضرور تھے لیکن سرمایہ دار نہیں تھے، انہوں نے مال کو اپنا ذاتی کمال اور حقیقی ملکیت سمجھ کر اور اسے ذخیرہ کر کے ذاتی زندگی کے معیار کو عام مسلمانوں سے اٹھانے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے کعب بن اشرف اور یہودِ خیبر کی طرح ذاتی قلعے بھی تعمیر نہیں کیے، نہ ہی روم وفارس کے عیاشوں کی طرح سونے چاندی، ریشمی لباس اور سازوسامان کے ڈھیر جمع کیے، بلکہ وہ خوب کماتے اور قناعت کے ساتھ ضروریات کی تکمیل کر کے باقی امت کی بہبود وفلاح کے لیے خرچ کرتے۔

معاشی وسائل میں ترجیحات کا تعین

قرآن مجید کے دیئے گئے اسی معاشی شعور کی بنیاد پر آپ ﷺ وسائل میں ترجیحات کے تعین کو بڑی توجہ دیتے تھے۔ اسے ایک واقعہ سے بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم کی ایک طویل روایت میں منقول ہے کہ آپ ﷺ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما سمیت ایک انصاری کے ہاں تشریف لے گئے، اس نے اتنے عظیم مہمانوں کی آمد پر بکری ذبح کرنے کے لیے چھری اٹھائی اور اپنے ریوڑ میں گھس گیا تو حضور اقدس ﷺ نے پیچھے سے آوازدی: ایاک والحلوب! خیال رکھیے کہیں دودھ والی بکری ذبح نہ کر لینا۔ (مسلم، کتاب الاشربۃ)

حدیث مبارک کے اس آخری مستقل جملہ میں اسلامی معیشت کا اہم اصول ہے، کھانے کے لیے گوشت مہیا کرنا ایک ضرورت ہے لیکن یہ ضرورت کسی ایسی بکری کو ذبح کر کے بھی پوری کی جاسکتی ہے، جو دودھ نہ دیتی ہو، دودھ والی بکری مستقل ذریعہ روزگار ہے، اسے اگر کھانے کے لیے ذبح کر دیا جائے گا تو مستقل وسیلہ معیشت کو ضائع کرنا لازم آئے گا۔ عربوں میں دودھ کا جانور انتہائی قیمتی شمار ہوتا تھا اور اس سے گھر کی کفالت ہوتی تھی، ایسے جانور کو اگر ضیافت میں پیش کر دیا جاتا تو گھر کی معاشی ضروریات میں تنگی پیش آنے کا امکان تھا۔

آج ہمارے ہاں بجلی، پانی، تیل، گیس، زرعی زمینوں اور دیگر ذخائر ووسائل کو جس طرح ضائع کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری سیاست میں وسائل کے استعمال میں ترجیحات کے تعین کا کوئی شعور نہیں دیا جاتا۔ آج محض رہائش کے لیے قیمتی زرعی زمینوں اور باغات کا قتل عام جاری ہے، نمائشی فرنیچر کے لیے جنگلات کے جنگلات کاٹے جارہے ہیں۔ اس سے ہمیں ماحولیاتی تباہی اور غذائی کمی کے جو خدشات لاحق ہورہے ہیں ان سے موجودہ سیاسی قیادت نے مکمل آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ آئندہ نسلوں کو اس عمل کے کیا ہولناک نتائج دیکھنے ہوں گے وہ اللہ ہی جانے! حالانکہ رہائش کے لیے بنجر زمینوں کو کام میں لایا جاسکتا ہے۔ جبکہ نمائشی امور کے لیے جنگلات جیسی دولت کا دھڑا دھڑ صفایا بدترین بدعقلی ہے جسے کوئی سیاسی شعور رکھنے والی قوم قطعاً گوارا نہیں کر سکتی۔

یہ حدیث ہمیں سبق دیتی ہے کہ معاشی میدان میں وسائل روزگار کی انتہائی حفاظت رکھنی چاہیے، ایسے کام یا پالیسی ترتیب دینا جس سے قوم کے دیوالیہ ہونے کے امکانات بڑھ جائیں اور وسائل روزگار خطرے میں پڑ جائیں، سیاسی بے شعوری کی علامت ہے۔

یہ حدیث معاشی میدان میں ہمیں ترجیحات کے تعین کا درس دیتی ہے، اگر ایک شخص کے پاس بنیادی ضرورت پوری کرنے وسائل ہیں تو اسے بنیادی ضروریات کی تکمیل تک ہی خود کو محدود رکھنا چاہیے، ان وسائل کو غیر ضروری امور یا سہولت وآسائش کے کاموں میں برباد نہیں کرنا چاہیے۔ مثلا ایک ملک مقروض ہے لیکن وہاں غیر ضروری بلند وبالا عمارات تعمیر کی جارہی ہیں، اس میں بنیادی غذائی ضروریات کی قلت ہے، لیکن سرکاری تقریبات میں لاکھوں کے کھانے پک رہے ہیں، علاج معالجے کی ضروری سہولیات مہیا نہیں ہیں لیکن بڑے بڑے اسٹیڈیم تعمیر ہورہے ہیں، بیروزگاری سے لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں، لیکن سرکاری وسائل لژگری گاڑیوں اور بڑی بڑی موٹرویز تعمیر ہونے پر خرچ ہو رہے ہیں، عوام کو صاف پانی تک فراہم نہیں ہو پاتا لیکن ان کا زرمبادلہ حکمرانوں کے کتے بلے نہانے کے برانڈڈ صابن اور شیمپوؤں پر خرچ ہو رہا ہے۔ تو ایسی قوم معاشی بحرانوں سے نکلنے کا صرف خواب دیکھ سکتی ہے، اسے عملی جامہ کبھی نہیں پہنا سکتی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی معاشی منصوبہ بندی

قرآن مجید کے ذکر کردہ قصص الانبیاء میں احسن القصص کا مقام حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو حاصل ہے، اس واقعہ میں عبرت و موعظت کے در جنوں پہلو ہیں، تاہم اس واقعہ کا سیاسی و معاشی پہلو انتہائی اہم ہے۔ ہم ذیل میں مختصراً صرف اسی پہلو کا ذکر کریں گے۔

(۱) حوادث: بلند اہداف کی تربیت گاہ

حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کے حسد کے باعث کنویں میں گرائے جانا، قافلہ کے ہاتھ چڑھنا، مصر کے بازار میں بکنا، عزیز مصر کے گھر پرورش پانا، عزیز کی بیوی کا آپ کے حسن و جمال پر مفتون ہونا، اس فتنہ سے خلاصی کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کا ناکردہ جرم میں جیل جانا، جیل میں طویل عرصہ قیام اور اللہ تعالیٰ کی طرف پیچیدہ معاملات کو سلجھانے کا فہم، علم نبوت اور قوت فیصلہ سے سرفراز ہونا، جیل میں دین حق کی تعلیم و تبلیغ کا فریضہ انجام دینا، جیل کے دو ساتھیوں کو خواب کی تعبیر بتانا اور اس ساتھی کے ذریعے بادشاہ مصر سے آپ کا تعارف ہونا خداوند قدوس کے تکوینی نظام کی وہ عجیب و غریب کڑیاں ہیں جو محض اتفاق نہیں بلکہ تخت مصر تک یوسف علیہ السلام کی رسائی کی ایک عجیب و مستحکم تدبیر ہے۔

(۲) داعیان کا مشن کہیں نہیں رکتا

دوران جیل یوسف علیہ السلام کی تعلیم و تبلیغ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ داعیان حق سخت سے سخت اور محدود حالات میں بھی اپنا بنیادی فریضہ ترک نہیں کرتے اور انہیں جیسے اور جس قدر مخاطب میسر ہوں وہ ان کی ذہنی سطح کے مطابق دعوت دین کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ۔ ؕ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (یوسف:۳۹،۴۰)

ترجمہ: اے میرے قیدی ساتھیو! کیا جدا جدا کئی معبود بہتر ہیں یا اللہ جو ایک اور زبردست ہے۔ تم اللہ کے سوا صرف ناموں ہی کی پرستش کرتے ہو، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گڑھ دیئے ہیں، جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ حکومت صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس نے حکم دیا ہے، کہ تم اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو یہی درست دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۳) اہل سیادت کے لیے اعلیٰ اخلاقی قدروں کی اہمیت

مصر بت پرستی کا مرکز تھا، جیل کے قیدی بھی اسی مذہب کے پیروکار تھے، لیکن یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل کے قیدیوں کے مکالمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی محبت وعقیدت سے وہ سرشار تھے اور ان کے لیے قلب میں انتہائی احترام اور دوستانہ جذبات رکھتے تھے۔ داعی کے مکارم اخلاق اس قدر اونچے ہونے چاہئیں کہ وہ محض اپنے عقیدت مندوں کی محبت کا محور نہ ہو بلکہ اپنے اعلیٰ انسانی صفات واخلاق سے غیروں کے دلوں میں بھی اپنی اہمیت، وقعت اور محبت کے بیج بو دے۔

(۴) اہل سیادت دل میں رنجشیں نہیں پالتے

بادشاہ مصر خواب دیکھتا ہے، خواب کی تعبیر کے لیے پریشان ہے، یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں وقت گزارنے والا بادشاہ کا ایک مقرب جو کسی زمانے میں بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں جیل کاٹ چکا ہے اسے یوسف علیہ السلام کا پتہ بتاتا ہے اور تعبیر خواب معلوم کرنے کے لیے جیل خانے جانے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے اس کی رہائی کے وقت اسے ایک کام سپرد کیا ہوتا ہے کہ تم آزادی کے بعد بادشاہ کے پاس اپنی نوکری پر بحال ہو جاؤ گے تو بادشاہ سے ذکر

کرنا کہ ایک بے گناہ قیدی اس غیر منصفانہ نظام میں طاقتوروں کے جبر کا شکار ہو کر قید خانے میں انصاف کا منتظر ہے، وہ قیدی آزاد ہوتا ہے، بادشاہ کے پاس اپنے سابقہ عہدہ پر بحال ہو جاتا ہے۔ لیکن یوسف علیہ السلام کی بات بھول جاتا ہے۔ چاہیے کہ ملاقات پر اس سے شکوہ شکایت کی جاتی لیکن مجسم اخلاق یوسف اس سے نہ صرف خندہ پیشانی سے ملتے ہیں بلکہ اس کی لائی ہوئی درخواست پوری کرتے ہیں۔ دینی وسیاسی قیادت کو دلوں میں عوام سے رنجشیں نہیں پالنی چاہئیں، نہ لوگوں کے کام اس واسطے ٹالنے چاہئیں کہ یہ الیکشن میں ہمارے کام نہیں آئے۔ نبوی سیاست کا خاصہ یہ ہے کہ اپنی خدمات کا دائرہ سب کے لیے عام رکھنا چاہیے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک بے آسرا قیدی کو ناجائز قید وبند سے اپنی رہائی کی کوشش بہر صورت جاری رکھنی چاہیے اور مایوس نہیں ہونا چاہیے، چاہے اسے قید کرنے والے طاقت کے مراکز ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ تک اپنی بے گناہی پہنچانے کا ایک موقع مل رہا تھا تو آپ نے اس موقع کا استعمال کیا اور قیدی کے ذریعے اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کی۔

وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ۔(یوسف:۴۲)

ترجمہ: اور یوسف نے کہا اس سے جس کے ان دونوں میں سے بچنے کا گمان کیا کہ تم اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا، مگر شیطان نے اسے اپنے مالک سے ذکر کرنا بھلا دیا۔ تو یوسف علیہ السلام چند سال (مزید) قید میں رہے۔

وَ قَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ۔ یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ۔ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ۔(یوسف:۴۵تا۴۸)

ترجمہ: اور کہا اس نے جو ان دونوں میں بچ گیا تھا اور اسے ایک مدت کے بعد یاد آیا کہ میں تمہیں اس کی تعبیر بتاؤں گا پس مجھے بھیج دو۔ یوسف! اے دوست! ہمیں (خواب کی تعبیر بتا دیجئے) کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں ان کو سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں۔ اور سات خوشے ہیں سبز اور دوسرے سات خشک، تاکہ میں لوگوں کے پاس لوٹ کر جاؤں، شاید انہیں بھی علم ہو جائے، یوسف نے کہا: تم سات سال لگاتار کاشتکاری کرتے رہو گے، پھر جو تم کاٹو تو اسے اس کے خوشوں میں چھوڑ دو، ہاں! مگر تھوڑا سا جو تم اس میں سے کھاؤ گے، پھر اس کے بعد سات سخت سال آئیں گے تم نے جو کچھ ان کے لیے پہلے سے جمع کر رکھا ہو گا اسے کھا جائیں گے، سوائے اس کے جو تم تھوڑا بچاؤ گے۔

(۵) اہل سیادت اصحاب فضل و کمال کی قدر کرتے ہیں

بادشاہ کا مقرب بادشاہ کے خواب کی تعبیر معلوم کر کے بادشاہ کو سناتا ہے، کہ مصر کو ایک زبردشت معاشی بحران پیش آنے والا ہے، سات سال تو خوب فصلیں اگیں گی لیکن اگلے سات سال قحط سالی ہو گی۔ بادشاہ یوسف علیہ السلام کے علم و فہم سے متاثر ہوتا ہے اور مقرب سے کہتا ہے کہ اس کی آزادی کا پروانہ لے کر جیل جاؤ اور اسے میرے پاس لے آؤ۔ بادشاہ گو مشرک تھا لیکن سیاسی بصیرت رکھتا تھا، اس نے چاہا کہ یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کی قدر کی جائے۔ سیاسی قیادت ایسے اصحاب فضل و کمال کی قدر دان ہونی چاہیے جن کے پاس ملک و قوم کو سیاسی و معاشی بحرانوں سے نکالنے کا علم و فہم ہو۔ یہ عوامی سیاست کا مظہر ہوتا ہے، ورنہ جن سیاست دانوں کو عوام سے کوئی سروکار نہ ہو ان کے ہاں ملک و ملت کے مفاد میں مفید لوگوں کی کوئی قدر نہیں ہوتی، نتیجتاً ایسے سیاست دان ملک و ملت کو کشتی ڈبو دیتے ہیں اور ان کو بہ آسانی دستیاب اصحاب فضل و کمال غیروں کی تعمیر و ترقی میں کام آتے ہیں۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ۔ (یوسف:۵۰)

ترجمہ: اور کہا بادشاہ نے اسے میرے پاس لے آؤ۔

(۶) اہل حق کو ذاتی مفاد کی بجائے اہداف محبوب ہوتے ہیں

یوسف علیہ السلام ایک طویل عرصہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر چکے تھے، آزادی کا پروانہ دیکھ کر انہیں بے تابی سے نکلنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے تھا، لیکن ان کی بصیرت نے بادشاہ کے فہم کو بھانپ لیا، اس لیے انہوں نے مناسب سمجھا کہ یہی بہترین موقع ہے کہ اپنے سے اس ناکردہ جرم کا داغ دھویا جائے، اپنی بے گناہی بھی ثابت کی جائے اور بادشاہ کو اپنے نظام انصاف کا آئینہ دکھایا جائے کہ کس طرح ایک شاہی فرد کی خواہش پر ایک بے گناہ شخص کو سالہا سال جیل میں رکھا گیا ہے۔ اس لیے انہوں نے خواتین مصر کے اس معاملہ کی آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا جس کی بنیاد پر آپ علیہ السلام کو قید میں ڈالا گیا تھا اور اپنی رہائی کو ان آزادانہ تحقیقات سے مشروط کیا۔ اہل سیاست کو جب بھی ایسے مواقع میسر آئیں جہاں اپنے مفاد کو معرض خطر میں ڈال کر نظام کی اصلاح کی توقع ہو سکتی ہے تو انہیں اس میں کوتاہی نہیں برتنی چاہیے۔ نیز اہل حق کو کبھی یہ گوارا نہیں کرنا چاہیے کہ اپنے سر ناکردہ گناہوں کے الزام کا بوجھ لیتے پھریں بلکہ جب بھی مناسب مواقع میسر آئیں، اپنے اوپر لگنے والے الزامات صاف کرنے چاہئیں کیونکہ معاشرہ ان سے عقیدت کی بنیاد پر وابستہ ہوتا ہے اور عقیدت قائم رہنے کے لیے قیادت کا بے داغ رہنا ضروری ہوتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿یوسف:۵۰﴾

ترجمہ: پس جب آیا اس کے پاس قاصد تو یوسف نے کہا: اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، بے شک میرا رب ان کے مکر سے خوب واقف ہیں۔

(۷) حرام اور وقتی مزہ ٹھکرانا اہل حق کا شیوہ ہے

یوسف علیہ السلام پر مصری وزیر کی اہلیہ مفتون تھی، یوسف علیہ السلام کے حوالے سے جب

خواتین میں اس کا چرچا ہوا اور اسے ملامت کیا گیا تو اس نے حسن یوسفی کا نظارا کروانے خواتین کی دعوت کی تھی، جہاں خواتین نے ہاتھوں میں لیے پھلوں کی بجائے انگلیوں پر چھریاں چلا دی تھیں۔ یوسف علیہ السلام پر دباؤ ڈالا گیا تھا کہ وہ مطالبہ قبول کرے یا جیل جائے۔ یوسف علیہ السلام کی نزاہت وعصمت کا عزیز مصر کو بھی یقین تھا لیکن عوامی بدنامی کے خوف سے آپ علیہ السلام کو ہی جیل میں ڈال دیا گیا، یوسف علیہ السلام جیل تو چلے گئے لیکن "ناحق" کو اختیار نہیں کیا اور نبوی عصمت ونزاہت کے ساتھ کب وہ مجازی محبت کا شکار ہوسکتے تھے۔ اہل سیادت کی اخلاقی سطح اتنی بلند ہونی چاہیے کہ راہ حق میں باطل کی طرف سے پیش کیے جانے والے لذائذ، عہدوں، مراعات کا شکار نہ ہوں گو کہ انہیں ان لذائذ کو ٹھکرانے کی کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑے، حق پر جمنے کی پاداش میں جیلیں سنت یوسفی اور نبوی سیاست کا خاصہ ہے، معمولی اور وقتی مفاد ومزوں کے لیے حق سے انحراف اہل دین کا شیوہ نہیں۔

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ۔ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ۔ (یوسف:۳۲تا۳۵)

ترجمہ: اور جو میں کہتی ہوں اگر اس نے نہ کیا تو یقیناوہ قید کر دیا جائے گا، اور بے عزت لوگوں میں سے ہو گا۔ یوسف نے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھے قید اس سے زیادہ پسند ہے جس کی وہ مجھے بلاتی ہے، اور اگر تو نے ان کے مکر وفریب کو مجھ سے نہ روکا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو جاؤں گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کرلی اور اس سے ان کے مکر وفریب کو دور کر دیا، بے شک اللہ تعالیٰ ہر بات کو سنتا اور جانتا ہے، پھر جب انہوں نے سب نشانیاں دیکھ لیں تو ان کو یہی بات سوجھی کہ یوسف کو ایک وقت تک قید کر دیں۔

(۹) اہل سیادت احسان فراموش نہیں ہوتے

حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کا پیام لانے والے اپنے ساتھی کے ذریعے جب بادشاہ سے آزادانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا، تو اس میں صرف خواتین کی اس مجلس کو عنوان بنایا، عزیز مصر کی بیوی کا پھر بھی ذکر نہیں کیا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عزیز مصر نے انہیں پالا تھا، وہ انہیں اپنا محسن سمجھتے تھے لہذا آپ نے گوارا نہیں کیا کہ ان کی بیوی جو اس معاملہ کا اصل کردار تھی کا ذکر کر کے ان کی رسوائی ہو۔ نیز آپ کا مقصد صرف اپنی بے گناہی کا اثبات تھا، جو محض ان خواتین سے حقیقت حال معلوم کرنے پر ہو سکتا تھا، لہذا عزیز مصر کی بیوی کو تحقیقات کا ہدف بنا کر اس کی رسوائی کرانا مقصود نہ تھا۔ اہل سیادت ان نبوی اخلاق سے متصف ہونے چاہئیں، انہیں ناکردہ جرائم سے اپنی برأت ضرور ظاہر کرنی چاہیے، تاہم اس میں اگر ان کے محسنین پر زد پڑتی ہو تو کوشش کرنی چاہیے کہ ذاتی انتقام میں سابقہ احسانات کو نہ بھولیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ﴿یوسف:۵۰﴾

ترجمہ: پس جب آیا اس کے پاس قاصد تو یوسف نے کہا: اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، بے شک میرا رب ان کے مکر سے خوب واقف ہیں۔

(۹) اہل سیادت مناصب کے لیے معیار و میرٹ کو مقدم رکھیں

بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کے مطالبہ پر براہ راست خود تحقیقات کیں، یوسف علیہ السلام کی برأت ثابت ہوئی، تو بادشاہ کے دل میں ان کی عقیدت مزید بڑھ گئی اور انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ میں یوسف علیہ السلام کو اپنا مشیر خاص مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ اس منصب کی خوش بختی ہے کہ اسے ان صفات کی حامل شخصیت مل جائے، یوسف علیہ السلام کی بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو

بغوی کی روایت کے مطابق بادشاہ نے آپ سے کئی زبانوں میں گفتگو کی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سب زبانوں میں جواب اور عربی و عبرانی دو مزید زبانیں بھی سنائیں جن سے بادشاہ واقف نہ تھا، بادشاہ کی دل میں اس سے آپ کے علم و فہم کی غیر معمولی وقعت قائم ہو گئی۔

(معارف القرآن، ج:۵، ص:۸۸)

اہل سیادت اگر کسی شخصیت میں منصب کی اہلیت دیکھیں تو اسے منصب پیش کرنا ہی کامیاب سیادت کی علامت ہوتی ہے، نیز جہاں تعارف یا جانچ مقصود ہو ایسے مواقع پر اپنے علم و فضل اور تجربہ کا اظہار بھی کوئی امر مانع نہیں تاکہ دوسرا آپ کے بارے میں درست رائے قائم کر سکے، ایسے مواقع پر اپنا حقیقی علم و فضل چھپانا تواضع نہیں۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿یوسف:۵۵﴾

ترجمہ: اور بادشاہ نے کہا اس کو میرے پاس لاؤ میں اس سے اپنا خاص مشیر بناؤں گا، پھر جب اس نے اس سے بات کی تو کہا بے شک! آپ آج سے ہمارے پاس معزز اور صاحب اعتماد ہو۔ یوسف نے کہا کہ آپ مجھے ملکی خزانوں پر مقرر کر دیجئے، بے شک! میں بہت اچھا محافظ اور (اس کام) سے پورا واقف ہوں۔

(۱۰) حضرت یوسف علیہ السلام کا معاشی منصوبہ

بادشاہ مصر حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات میں ان صلاحیتوں کو بھانپ چکا تھا، نیز ان سے براہ راست خواب کی تعبیر سن چکا تھا، لہذا انہوں نے اگلا سوال یہ کیا کہ اس بحران سے نکلنے کا مکمل منصوبہ کیا ہے؟ آپ علیہ السلام نے انہیں معاشی منصوبہ کے تین نکات ارشاد فرمائے:

۱۔ اپنی تمام قابل کاشت زرعی اراضی کو سات سال تک جن میں خوب بارشیں ہونی ہیں مسلسل کاشت کرنا ہے، عوام کو پابند بنانا ہے کہ کوئی قابل کاشت خطہ کاشت کے بغیر نہ رہے۔ اس سلسلے میں حکومت جتنی کاوش کرے اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔ سرکاری زمینوں کو بھی اسی حساب

سے سات سال تک مسلسل کاشت کرنا ہے۔

۲۔ عوام اپنی فصلوں کا پانچواں حصہ ہر سال محفوظ رکھیں گے، حفاظتی بندوبست کے لیے اناج کو خوشوں کے اندر رہنے دیا جائے گا اور اس پر مٹی لیپ دی جائے گی، اس سے اناج کو کیڑا نہیں لگتا۔ گویا یہ زرعی علم کے ذریعے اناج کو طویل عرصہ تک محفوظ رکھنے کی ایک شکل تھی، جو بذریعہ وحی آپ کو تعلیم کی گئی۔ یوں عوام آئندہ سالوں میں بڑی حد تک خود کفیل ہوں گے اور حکومتی خزانے پر ان کا بوجھ کم سے کم ہو گا۔

۳۔ سرکاری زمینوں کا اناج سات سال تک مکمل محفوظ کیا جائے اور گردوپیش میں قحط سالی سے متاثرہ ممالک کی خلق خدا پر سستے داموں بیچا جائے۔ جب طلب بڑھتی ہے اور رسد کم ہو تو فطری طور پر قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، لیکن یوسف علیہ السلام نے اپنے معاشی منصوبے کی بنیاد طلب ورسد کے سرمایہ دارانہ قانون پر نہیں رکھی بلکہ بھائی چارے اور انسان دوستی کو بنیاد بنایا، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ قحط زدہ ممالک کے لوگوں کا سارا زور مصر کی طرف تھا، کیونکہ اتنا سستا اناج کہیں اور دستیاب نہ تھا، اس طرح خریدار بڑھنے سے مصری خزانے کو جو غیر معمولی فائدہ ہوا وہ اس کے بغیر ممکن نہ تھا، اس کے ساتھ اطراف ملک میں حکومت کی جو نیک نامی وانسان دوستی کا شہرہ ہوا اس نے سلطنت کے استحکام میں کلیدی کردار ادا کیا۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ۔ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ (یوسف:۴۸،۴۷)

ترجمہ: یوسف نے کہا: تم سات سال لگاتار کاشتکاری کرتے رہو گے، پھر جو تم کاٹو تو اسے اس کے خوشوں میں چھوڑ دو، ہاں! مگر تھوڑا سا جو تم اس میں سے کھاؤ گے، پھر اس کے بعد سات سخت سال آئیں گے تم نے جو کچھ ان کے لیے پہلے سے جمع کر رکھا ہو گا اسے کھا جائیں گے، سوائے اس کے جو تم تھوڑا بچاؤ گے۔

(۱۱)اگر متبادل نہ ہو تو خود کو منصب کے لیے پیش کرنے میں حرج نہیں

بادشاہ مصر اس بہترین منصوبے کو سن کر مسرور و مطمئن تو ہوا لیکن سوال یہ تھا کہ یہ مشکل اور عظیم منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچائے گا کون؟ اس کے لیے بہترین صلاحیتیں اور نظم وانصرام کی غیر معمولی قوت درکار تھی۔ انہوں نے یوسف علیہ السلام سے استفسار کیا تو آپ نے وزارت خزانہ و زراعت کے خود کو پیش کیا۔ کیونکہ آپ کو اندازہ تھا کہ مملکت مصر کے پاس اس بحران سے نکلنے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے والی کوئی موزوں شخصیت موجود نہیں اور جب متبادل نہ ہو تو انسانیت کو بحرانوں کے رحم وکرم پر چھوڑنے کی بجائے آگے بڑھ زمام اقتدار ہاتھ میں لے لینی چاہیے۔ ورنہ سیاستِ اسلامی کا اصل مزاج تو یہ ہے کہ منصب وذمہ داری کو خود سے طلب نہ کیا جائے۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ جو خود عہدہ طلب کرے، اس کی نصرت نہیں کی جاتی۔

شاہ مصر اگرچہ یوسف علیہ السلام کے کمالات کا معترف ہو گیا تھا تاہم اسے فوراً منصب حوالے نہیں بلکہ ایک سال تک معزز شاہی مہمان کے طور پر اپنے پاس رکھا، جب انہیں سال بھر کی رفاقت میں آپ کی نبوی علم وفہم کا پورا تجربہ ہو گیا تو نہ صرف وزارت خزانہ بلکہ تمام امور سلطنت ان کے حوالے کر کے خود یکسو ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل سیادت کو بڑے مناصب کے لیے افراد کے چناؤ میں جلد باز نہیں ہونا چاہیے۔ (مستفاد: معارف القرآن، ج:۵، ص:۸۸)

(۱۲)اسلامی سیاست میں حکومتی مناصب کے لیے درکار صفات

اسلامی سیاست میں مناصب کوٹہ سسٹم پر تقسیم نہیں ہوتے بلکہ ان کے لیے کچھ خاص صلاحیتیں اور صفات درکار ہوتی ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس علم وحکمت تو تھی ہی جس کا اعتراف شاہ مصر کو بھی تھا، لیکن کسی منصب وعہدہ کے لیے علم وحکمت سے بڑھ کر بھی معنوی صفات ہونا لازمی ہیں، لہذا منصب طلبی کے موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی دو خاص اوصاف کا ذکر کیا جن کا تعلق وزارت خزانہ اور ملک کو معاشی بحران سے نکالنے کے ساتھ تھا۔ آپ اپنا پہلا وصف حفیظ ذکر کیا، وزیر خزانہ کے لیے پہلا ضروری وصف یہی ہے کہ اموال کا حفاظتی ایسا محفوظ نظام قائم کرے کہ

وسائل ملکی ضائع نہ ہوں، لوٹ کھسوٹ اور غیر مستحق افراد کے دسترس سے بچیں رہیں۔ ایسے مصارف میں خرچ نہ ہونے دے جہاں ضرورت نہ ہو یعنی وسائل کے صرف میں ترجیحات کا درست تعین کرے۔ اس کے ساتھ وہ ذاتی زندگی میں بھی دیانت وامانت کے اوصاف سے متصف ہو۔

دوسرا وصف علیم ذکر کیا یعنی اسے دستیاب وسائل کے دائرے میں مسائل کے حل اور قوم کو معاشی بحران سے نکالنے کا مکمل علم اور مہارت بھی ہے، اگر ایک شخص امانت دار تو ہے لیکن اس کے پاس اپنے شعبہ کا متعلقہ علم نہیں ہے تو وہ قوموں کو بحران سے نہیں نکال سکتا۔

آج کے برپا معاشی بحرانوں کی پشت پر یہی المیہ کار فرما ہے کہ نہ وسائل کی حفاظت کا کوئی بندوبست ہے نہ ہی ان کے صرف میں دیانت وامانت کا کوئی پاس ہے اور نہ ہی قوموں کو بحرانوں سے نکالنے کے لیے افرادکار میں علم وفہم کی مطلوبہ سطح موجود ہے، اس لیے انسانیت وسائل کی بہتات کے باوجود انتہائی مشکل زندگی گزارنے پر مجبور ہے، اگر آج بھی ان دوصفات کی حامل شخصیات اسلامی سیاسیات کی باگ ڈور سنبھالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک وملت کو درپیش معاشی بحرانوں کا قلع قمع کیا جاسکے۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿یوسف:۵۵﴾

ترجمہ: اور یوسف نے کہا: آپ مجھے ملکی خزانوں پر مقرر کر دیجیے۔ بے شک میں بہت اچھا محافظ ہوں اور اس کام سے پورا واقف ہوں۔

(۱۳) حوادث میں اشراف وسفید پوشوں کی رعایت رکھنی چاہیے

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی منصوبہ بندی کے مطابق معاشی وسائل کو اس سلیقہ سے محفوظ کیا کہ قحط سالی کے دوران مصری عوام کو کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا، گردوپیش کے ممالک کے لوگوں کو بھی غلہ واناج سستے داموں مہیا کرنے کی سرکاری پالیسی روبہ عمل لائی، جس سے آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، اطراف سے قافلے مصر ٹوٹ پڑے، انہی میں کنعان سے آپ کے بھائیوں کا قافلہ بھی غلہ خریدنے مصر پہنچا، آپ بیرونی قافلوں سے ملتے اور تقسیم غلہ کے امور کی

براہ راست نگرانی کرتے، ان میں ذمہ داروں کے لیے سبق ہے کہ اپنے کام ماتحتوں کے ذمہ لگا مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے، بلکہ مسلسل نگرانی رکھنی چاہیے یہی ایک کامیاب سیادت کا اصول ہے۔ آپ نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا جبکہ وہ آپ کو نہ پہچان سکے، آپ نے واپسی پر ان کے غلہ میں ان کی رقم واپس چھپا کر رکھوادی۔ اہل سیادت کو اشراف، اولاد انبیاء اور سفید پوشوں کا ایسے حوادث میں خاص خیال رکھنا چاہیے اور ان کے لیے سرکاری خزانے سے تعاون کی صورتیں مہیا کرنی چاہئیں ۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ (یوسف:۶۵)

ترجمہ: اور جب انہوں نے سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی بھی واپس کر دی گئی ہے۔

(۱۴) اسلامی سیاست کا اہم اصول: قناعت

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو روکنے کے بحکم الٰہی ان کے اناج میں اپنا پیالہ چھپا دیا تھا، اس کے لیے قرآن مجید میں "سقایہ" اور "صواع" کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، سقایہ پانی پینے کے برتن کو کہا جاتا ہے، جبکہ صواع اس برتن کو کہتے ہیں جس سے غلہ ماپا جاتا ہے۔ مفسرین نے یہاں یہ نکتہ لکھا ہے کہ اس برتن سے دونوں کام لیے جاتے تھے۔ قرآن مجید نے بالقصد یہاں اس کے دونوں اوصاف ذکر کر کے اسلامی سیاست و معیشت کے ایک اہم اصول "قناعت" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حکومتی کاموں کے لیے کم سے کم آلات و وسائل سے جتنا زیادہ کام لیا جا سکے یہی مطلوب ہے، یہ اصول عمارتوں، گاڑیوں، اشخاص سب میں جاری ہوتا ہے، کئی کاموں کے لیے ایک گاڑی استعمال ہو سکے تو ہر کام کے لیے علیحدہ مناسب نہیں، کئی شعبے ایک عمارت میں سمٹ سکیں تو ہر شعبہ کے لیے الگ بلڈنگ کھڑی کرنا محض نمائشی حماقت ہے، ایک شخص کئی کام سنبھال سکے تو انتظامی کابینہ میں افراد کی فوج ظفر موج بھرتی کر دینا سرکاری وسائل کے ساتھ بدترین ظلم ہے۔ ان امور میں اگر اس اصول سے کام لیا جائے تو قومی خزانہ پر پڑنے والا بے تحاشا معاشی بوجھ کم کیا جا سکتا ہے۔

اس اصول کو درآمدات تک وسعت دیں تو ایسی تمام اشیاء جن کی ملک و ملت کو عمومی ضرورت نہیں ہے، یا ان کا متبادل باآسانی مقامی سطح پر فراہم کیا جا سکتا ہے تو اس پر زر مبادلہ خرچ کرنا معاشی ظلم

ہے، جو قومیں ان قرآنی ارشادات پر اپنی معاشی منصوبہ بندی کی بنیاد رکھتی ہیں ان کے لیے کسی قسم کا بحران کوئی معنی نہیں رکھتا اور اس پر باآسانی قابو پالیتے ہیں۔ بحر و بر میں جو فساد برپا ہوتا ہے اس کے پیچھے انسان کا اپنا ہی کسب کار فرما ہوتا ہے ورنہ خدا تعالیٰ نے وسائل زندگی سے زمین کا پیٹ بھر دیا ہے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں خدا ہی کی تعلیمات کی روشنی میں خرچ کیا جائے۔

خلافت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی سیاسی قدریں

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو سطوت و سلطنت عطا فرمائی، اس میں اہل سیادت و قیادت اور نبوی سیاست کے حاملین کے لیے کئی بصائر و عبر پوشیدہ ہیں، ذیل میں ہم ان میں چند ایک کا تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) حضرت داؤد علیہ السلام نے طالوت کے لشکر میں شامل ہو کر جالوت کو قتل کیا، اللہ تعالیٰ نے اس جہاد و قربانی کی برکت سے آپ کو طالوت کا وارث بنادیا، طالوت علیہ السلام کی قائم کردہ حکومت کی باگ ڈور جب آپ کے ہاتھ آئی، تو آپ نے نبوی علم و فہم اور عدل وانصاف سے اسے کمال عروج پر پہنچا دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی سلطنت شام، عراق، فلسطین اور شرق اردن کے تمام علاقوں میں پھیل گئی اور خلیج عقبہ سے لے کر فرات تک سارے علاقے آپ کے زیر نگیں ہو گئے۔ اس عظیم غلبہ کی پشت خدا تعالیٰ کی رہنمائی اور وحی الٰہی کی قوت کار فرما تھی۔ آپ کو حکمت و دانش کا وہ حظ وافر عطا ہوا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ قضیہ بحکم الٰہی حل فرمادیتے۔ آپ کو فصل خطاب کی وہ قوت عطا کی گئی تھی کہ آپ کا قول حق و باطل اور صواب و خطا میں فیصلہ کن حیثیت کا حامل ہوتا تھا۔ نبوی سیاست میں قیادت پر فائز ایک شخصیت میں یہی صفات مطلوب ہیں۔ ان ہی کی بنیاد پر ایک مضبوط سیاسی نظم وجود میں آتا ہے۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔(ص:۲۰)

اور ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط کیا اور اس کو حکمت عطا کی اور صحیح فیصلہ کی قوت بخشی۔

(۲)اس عظیم سلطنت کے نظم وانصرام کے باوجود حضرت داؤد علیہ السلام ہمہ وقت خدا کی یاد میں مصرف رہتے، گھر کے اندر عبادت کے لیے ایک خاص خلوت خانہ مقرر تھا، اس محراب میں آپ خدا سے راز و نیاز اور شکر وامتنان میں ڈوبے رہتے، جب جلوت میں زبور پڑھتے تو آپ کی خوش نوائی پر انس تو کیا پرند وجمادات بھی جھوم پڑھتے اور طیور وجبال اس مدح سرائی میں آپ کے ہم زبان وہم نوا ہو جاتے۔ اس میں سیادت وقیادت پر فائز شخصیات کے لیے عبرت وموعظت ہے کہ اجتماعی ذمہ داریوں کے باوجود خدا تعالیٰ کی انفرادی عبادت وراز و نیاز اور شکر میں کوتاہی نہیں برتنی چاہیے کہ اس بغیر شخصیت میں وہ نکھار وپختگی پیدا نہیں ہوتی جو منصب سیادت کے لیے درکار ہوتی ہے۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

> قانون الٰہی ہے کہ جو ہستی عزت وعروج پر پہنچنے کے بعد جس قدر خدا کا شکر اور اس کے فضل وکرم کا اعتراف کرتی، اسی قدر اس کو بیش از بیش انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی پوری زندگی اس کی شاہد عدل ہے۔(قصص الانبیاء، ج:۲، ص:۹۴)

(۲)حضرت داؤد علیہ السلام کو سلطنت کی توسیع ودفاع میں دشمنوں کے ساتھ مسلسل جہاد و مقاومت کا سامنا رہا، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو معجزانہ قوتیں بخشیں تھیں، ان میں ایک یہ تھی کہ لوہا آپ کے لیے موم کر دیا تھا، ظاہر ہے جنگی سازوسامان کی تیاری میں لوہا بنیادی اہمیت کا حامل ہے، پھر ان ہتھیاروں اور دفاعی سازوسامان میں آپ کو خود دبار خداوند سے زرہ سازی کی صنعت سکھائی گئی اور اس کی حکمت یہ ارشاد فرمائی گئی کہ اس کے ذریعے لوگ دشمن سے بچاؤ اختیار کریں، بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہی صنعت حضرت داؤد علیہ السلام کا ذریعہ معاش تھی اور آپ امور سلطنت کا کوئی وظیفہ نہیں لیا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دشمن کی مقاومت ومقابلہ کے لیے ایسی صنعتوں کو فروغ دینا ضروری ہے جس میں جنگی ساز وسامان تیار ہوتا ہو اور اس کے لیے وسائل بہم پہنچانا اہل سیادت کی بنیادی ترجیح ہونی چاہیے۔ اگر دشمن کے مقابلے میں بچاؤ کا ساز وسامان مہیا نہ ہو تو جانی نقصان کا اندیشہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ حق کے فروغ کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی صنعتیں اہل ایمان کو اپنے ہاتھ میں رکھنی چاہئیں، تاکہ اس میں وہ کسی دست نگر و محتاج نہ ہوں۔ نیز اگر دفاعی ہتھیار و ساز سامان تو مہیا ہو لیکن اہل ایمان واہل ہمت کے پاس نہ ہو، تو دفاع کے وقت میں وہ بجائے کام آنے کے محض نمائش کے طور پر موجود ہو گا۔ ہتھیاروں سے اہل یمان واہل ہمت ہی بر موقع وبر وقت کام لے سکتے ہیں۔

اہل اسلام کی حکومتی ترجیحات میں دفاعی تیاری مقدم نوعیت کی ہونی چاہیے اور اس میں حکمرانوں کی ذاتی دلچسپی وکاوش ہونی چاہیے، کیونکہ الناس علی دین ملوکھم لوگ اپنے حکمرانوں کے طور وطریق پر ہوتے ہیں، اگر حکمران دشمنوں کے خلاف جنگی ہتھیاروں کی تیاری میں بذات خود دلچسپی رکھیں تو عوام ورعایا میں بھی ملک وملت کی دفاع اور حق کے فروغ ودشمن کے ساتھ مقابلہ ومقاومت کا مزاج پیدا ہو گا۔

اس میں اہل سیادت کے لیے یہ بھی سبق ہے کہ اگر ان کے لیے ممکن ہو سکے اور وہ اپنی معاشی ضروریات میں خود کفیل ہوں تو حکومتی خزانے پر بوجھ نہ ڈالیں، یہ بہت بڑی عزیمت ہے کہ ملک وملت اور عوام کی خدمت حسبۃ للہ کی جائے اور اس پر حکومتی خزانہ سے کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہ لیا جائے۔ نبوی سیاست کے حاملین کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ان اجری الا علی اللہ کا نعرہ لگا کر ملک وملت کے جملہ فرائض کو رضاکارانہ طور پر سرانجام دیتے ہیں۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ ۔(الانبیاء:۸۰)

ترجمہ: اور ہم نے اسے تمہارے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھائی، تاکہ وہ تم کو لڑائی کے نقصانات سے بچائے۔

(۴) قرآن وحدیث میں مذکور حضرت داؤد علیہ السلام کے بعض قضایا عدل سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی حکومت میں انصاف عام اور سستا تھا، نیز آپ عدل وقضا کے شعبہ کو خود ہی سنبھالتے تھے، اسی وجہ سے آپ کی سلطنت میں استحکام اور امن کا فروغ ہوا۔ انصاف کی فوری اور آسان فراہمی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ مدعی ومدعی علیہ آپ کی خلوت گاہ تک آپ کے ذاتی وقت میں پہنچ آئے، پھر معاملہ بھی اتنا حساس نہیں بلکہ دو بھائیوں کا مویشیوں پر جھگڑا تھا، پھر آنے والے انتہائی بے تکے طریقے سے پچھلی دیوار پھلانگ کر آئے تھے، لیکن مکارم اخلاق کی مجسم تصویر حضرت داؤد علیہ السلام اف تک نہیں کہتے، معاملہ سنتے ہیں، مظلوم کی داد رسی کرتے ہیں، مقدمہ سے ہٹ کر معاشی رہنمائی کرتے ہیں اور شرکت ومخالطت میں ہونے والے عام سماجی اور ظالمانہ رویہ کی نشان دہی کرتے ہیں، فوری فصلہ سناتے ہیں، لیکن فریقین کے جاتے ہی عدل وانصاف کے اس خوگر کو احساس ہوتا ہے کہ مدعی علیہ کو صفائی کا موقع دینے سے قبل ہی کچھ باتیں ایسی ارشاد فرمادیں جو مدعی علیہ کی طرف ظلم کی نسبت شمار ہو سکتی تھیں، اسے آزمائش خداوندی سمجھ کر فوری سجدہ ریز ہو کر استغفار کرتے ہیں۔

اس میں اہل سیادت کے لیے سبق ہے کہ اپنے اور عوام کے درمیان حاجب و دربان اور پروٹوکول کی ایسی دیواریں قطعاً نہیں کھڑی کرنی چاہئیں کہ وہ آپ تک رسائی نہ رکھیں اور انصاف کے لیے ترستے ورلتے رہیں۔

اسلامی سیاست وحکومت میں انصاف فوری وسستا ہونا چاہیے، فریقین کو لمبی چوڑی تاریخوں میں لٹکانا، انصاف کے حصول کے لیے زر کثیر خرچ کرنا، سفارشوں اور وکیلوں کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھانا ایک ظالمانہ عدالتی نظام کا خاصہ ہیں، جس سلطنت میں انصاف فوری اور آسان نہ ہو وہاں کبھی امن وآشتی اور استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔

مسلمان سیادت وقیادت کو نظام انصاف کی براہ راست نگرانی رکھنی چاہیے۔

اہل حق کی قیادت اتنی وسیع الظرف اور صبر وتحمل کی حامل ہونی چاہیے کہ عوام ورعایا کے بے

تکے کاموں میں فوری طیش میں نہ آئے، بلکہ اگر رعایا کا مقصد درست ہو تو طریق و ترتیب کی چھوٹی موٹی غلطیوں پر ان سے چشم پوشی برتنی چاہیے کیونکہ انہیں انصاف کے لیے حکمرانوں ہی کا سہارا ہوتا ہے۔ اگر حکمران انہیں برداشت نہیں کریں گے اور ان کی بات تحمل سے نہیں لیں گے تو ان میں بغاوت اور نفرت کے جذبات فروغ پائیں گے۔

اہل اللہ سیاست و حکومت میں خدا تعالیٰ کے احکام کی کامل پیروی کرتے ہیں اور اس میں اعلیٰ وافضل ترتیب پر چلتے ہیں اگر اس معیاری ترتیب میں ذرا بھر کوتاہی یا لغزش ہو تو فوراً توبہ تائب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ ان کی نظر اپنے کسی کمال پر جاتی ہی نہیں بلکہ وہ خود کو دست قدرت میں ایسا سمجھتے ہیں جیسے دست کاتب میں قلم۔ اور اپنی ہر کاوش کو خدا تعالیٰ ہی طرف منسوب کرتے ہیں۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۙ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَ لَا تُشْطِطْ وَ اهْدِنَاۤ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ۔اِنَّ هٰذَاۤ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّ لِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَ عَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ۔ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ۔ (ص:۲۱تا۲۴)

ترجمہ: اور کیا تجھ کو ان دعوے والوں کی خبر پہنچی ہے جب وہ دیوار کود کر عبادت خانہ میں گھس آئے، داؤد کے پاس۔ تو داؤد ان سے گھبرایا۔ وہ بولے گھبراؤ نہیں ہم جو جھگڑ رہے ہیں، زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر۔ سو ہمارے درمیان انصاف کے مطابق فیصلہ کر دے اور ٹالنے والی بات نہ کرنا اور ہم کو سیدھی راہ بتا۔ یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے یہاں ایک دنبی ہے، پس یہ کہتا ہے کہ وہ ایک بھی میرے حوالے کر دے اور مجھ سے گفتگو میں بھی تیز ہے۔ داؤد علیہ السلام نے کہا وہ اپنے دنبیوں میں تیری ایک دنبی کو ملانے کے لیے جو سوال کرتا ہے ظلم کرتا ہے اور اکثر شریک ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں الا یہ کہ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ اور ایسے

بہت کم ہیں۔ اور داؤد علیہ السلام کے خیال میں گزرا کہ ہم نے اس کا امتحان لیا، پس مغفرت چاہنے لگا وہ اپنے رب سے اور گر پڑا جھک کر اور رجوع ہوا خدا کے سامنے۔

(۵) خداوند قدوس نے داؤد علیہ السلام کو خلیفہ بنایا اور ارض مقدس اور اس کے گردو پیش وسیع علاقے کی سلطنت سے نوازا، حضرت داؤد علیہ السلام نے دعوت الی اللہ کا جو نظام قائم کیا اس نے خدا کے بندوں میں وہ صلاحیت وصالحیت پیدا کی جس کے بعد وہ صحیح معنوں میں وراثت نبوی اور خلافت الٰہی کے حق دار ٹھہرے، صالحیت وصلاحیت کے اس مطلوبہ معیار پر پورا اترنے کے بعد ہی انسان خلافت ارضی کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس مدعا کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لیے یہاں مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کا ایک طویل اقتباس نقل کرنا زیادہ مفید ہو گا:

> "قانون یہ ہے کہ اقوام وامم کو حکومت وسلطنت دو طرح حاصل ہوتی ہے ایک وراثت الٰہی کی معرفت اور دوسری دنیوی اسباب ووسائل کی معرفت۔ پہلی صورت میں کسی قوم کو حکومت عطا ہوتی ہے کہ اس کے عقائد واعمال میں پوری طرح وراثت الٰہی کارفرما ہو یعنی خدائے تعالیٰ کے ساتھ اس کا رشتہ عقیدت بھی صحیح اور استوار ہو اور وہ انفرادی واجتماعی اعمال میں بھی صلاح وخیر کے اس درجہ پر فائز ہو کہ قرآن عزیز کی اصطلاح میں اس کو "صالحین" میں شمار کیا جاسکے، یہ قوم بلاشبہ اس کی مستحق ہے کہ وہ خدا کے اس انعام سے بہرہ ور ہو جس کا عنوان "خلافت الٰہیہ" ہے اور جو درحقیقت دنیا میں خدائے تعالیٰ کی نیابت کا مظہر اور انبیاء ورسل کی پاک وراثت ہے، خدا کا وعدہ ہے کہ جو قوم بھی عقائد واعمال میں انبیاء ورسل کی وراثت سے فیض یاب ہے وہ وراثت ارضی کی بھی مالک ہو گی اور اگر دنیوی اسباب ووسائل کے پہاڑ بھی اس کے حصول کے درمیان حائل ہوں گے تو ان سب کو زیر وزبر کر کے خدائے تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء:۱۰۵) [اور ہم نے

بلاشبہ زبور میں نصیحت کے یہ لکھ دیا کہ خدا کی زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔]اورآیت: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔(الاعراف:۱۲۸)[بے شک زمین اللہ کی ہی ملکیت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بناتا ہے۔]میں اس کی مشیت کا یہی فیصلہ ہے کہ زمین کی وراثت انہی کو نصیب ہوتی ہے جو اس صالح بندے ہیں اور اگر کسی قوم یا امت میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے تو خواہ وہ مدعی اسلام ہی کیوں نہ ہو تو اس کو وراثت ارض نصیب نہیں ہو سکتی اور خلافت الہیہ اس کا حق نہیں بن سکتی ہے اور نہ اس قوم کی عظمت وعزت کے لیے خدا کے پاس کوئی وعدہ ہے، البتہ خدا کی مشیت اپنی حکمت ومصلحت کے پیش نظر کائنات کے نظم وانصرام کی خاطر جس کو چاہتی ہے حکومت عطا کر دیتی ہے اور جس سے چاہتی ہے سلب کر لیتی ہے۔ اس عطا وسلب میں اس کا قانون قدرت اسی طرح کار فرما رہتا ہے جس طرح اسباب کو مسببات کے ساتھ پیوند لگانے میں کار فرما ہے اور اس عطاونزع کے لیے اس قدر مختلف اور بے شمار مصالح ہوتے ہیں کہ انسان ان کی حقیقت تک رسائی سے عاجز ہے اور اس سلسلہ کی سب سے بھیانک اور بدبخت صورت یہ ہے کہ مسلمان غلام ومحکوم ہوں اور کفر وشرک کی حکومت ان پر ہیبت حاکمہ اور صاحب اقتدار ہو، گویا یہ خدا کا ایسا عقاب وعتاب ہے جو مسلمانوں کے لیے بداعمالیوں اور صلاح وخیر کی استعداد کے فقدان کی وجہ سے منصۂ شہود پر آتا ہے اور اس حالت میں مقام عبرت یہ ہوتا ہے کہ صاحب تاج وتخت کو اس لیے حکومت نہیں دی جاتی کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہیں بلکہ اس لیے عطا کی جاتی ہے کہ زمین کی ملکیت کے حقیقی وارثوں نے اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے استحقاق وراثت کو ہاتھ سے کھو گیا اور اب کائنات کے مصالح عامہ کے پیش نظر حکومت کے لیے نہ مسلم کی شرط ہے نہ کافر ومشرک کی۔ والله يؤتي ملكه من يشاء اوراللہ جس کو چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا ہے اور اگر مسلمان چشم

عبرت واکریں اور اپنی فاسد زندگی میں انقلاب برپا کر کے صالحین کا طغرائے امتیاز حاصل کرلیں تو خدا کا وعدہ بھی ان کو بشارت دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (النور:۵۵)

وعدہ کرلیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان والے ہیں اور کیے ہیں انہوں نے نیک کام۔ البتہ بعد کو حاکم کردے گا ان کو ملک میں، جیسا حاکم کیا تھا ان کے اگلوں کو اور جمادے گا ان کے لیے دین، جو پسند کرلیا ان کے واسطے اور دے گا ان کو ان کے خوف کے بدلے امن۔ (قصص القرآن، ج:۲، ص:۹۵تا۹۷)

(۶) حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت جناب طالوت کی اس تحریک کا تسلسل تھی جو ایک مہاجر کیمپ سے اٹھ کر طول و عرض میں چھاتی گئی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے سلطنت کو خدا کے دین کے فروغ کا ذریعہ بنایا ان کی توسیع سلطنت کے پیچھے صرف ایک ہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ دنیا کی ہر طاقت و قوت خدا کی کبریائی کے سامنے سرنگوں ہو جائے، ملکہ بلقیس کی سلطنت کو زیر نگیں لانے کے لیے آپ کے ارشادات اس کی کافی دلیل ہے۔

اس میں اہل سیادت کے لیے سبق ہے کہ تخت و تاج ملنے کے بعد اسے ذاتی آرام و آرائش اور سطوت کے لیے استعمال کرنے کے باوجود ملک و ملت کی ترقی اور خدا کے دین کے فروغ کے لیے کام میں لانا چاہیے اور اسے خدا کی امانت تصور کرنا چاہیے۔

(۷) حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے پرندے، جنات، ہوائیں اور کئی مخلوقات مسخر کر دی گئی تھیں، جو خود کو خدا کے سپرد کر دے، اپنا عیش و آرام خدا کے دین کے لیے وار دے اور خود کو خدا کی مرضی کے سامنے مٹا دے اللہ تعالیٰ ساری کائنات کو اس کی خدمت پر مامور و مسخر کر دیتے ہیں۔ اسے بڑی بڑی طاقتوں کے خلاف عام اسباب و وسائل کے دستور سے ہٹ کر ایسی فتوحات نصیب ہوتی

ہیں کہ مادہ پرستوں کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں، اس لیے وہ اس کے انکار یا اس میں کسی مادی طاقت کی خفیہ پشت پناہی کی تاویل کا سہارا لیتے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

"جس شخص کی زندگی خالص اللہ کے لیے ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ بھی اپنی کل کائنات اس کے لیے تابع اور مسخر کر دیتے ہیں اور اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی قدم بھی خدا کے مرضی کے خلاف نہیں اٹھتا۔ اب اگر ایسا شخص بعض ایسے امور کو کر دکھاتا ہے جو عام دنیوی اسباب ووسائل سے بالاتر ہو کر عمل میں آئے ہیں تو کوتاہ بین اور مشکوک نگاہیں دیکھنے اور سمجھنے کی تو زحمت گوارا نہیں کرتیں کہ جس ہستی سے یہ اعمال صادر ہوئے ہیں وہ خدا کی مرضی میں خود کو فنا کر چکی ہے، اس لیے خدا کی بے قید قدرت کا ہاتھ اس کے سر پر ہے اور اس کے انعامات یعنی معجزات کو بھی عام قوانین قدرت کی ترازو میں تول کر ان کے انکار پر آمادہ ہو جاتے ہیں، یہ راہ بے شبہ غلط اور گمراہی کی راہ ہے اور صاف اور روشن راہ مستقیم وہ ہے جس کو ہمیشہ سے مفکرین اسلام قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ یعنی عام قوانین قدرت کے خلاف امور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں لہذا ان کا انکار بداہت کا انکار ہے۔ اس لیے کہ قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے خالق کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بے قید قدرت سے کسی قانون کو توڑ دے۔ (قصص القرآن، ج:۲، ص:۱۷۴)

(۸) حضرت سلیمان علیہ السلام کی جنگی گھوڑوں سے محبت، معائنہ اور ان کی جانچ میں استغراق کا واقعہ قرآن مجید میں مذکور ہے، دشمن کے خلاف ایک اسلامی سلطنت کے لیے ہمیشہ جنگی ودفاعی امور میں مستعد رہنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر شر وفساد کے حاملین کے قلوب کو مرعوب کرنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں اور انہیں مرعوب رکھے بغیر امن عالم کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ شر وفساد کی عالمی قوتوں کو دبائے رکھنا ہی نظام امن عالم کا ضامن ہے۔ اہل سیادت وقیادت کو چاہیے کہ اپنے ملکی جنگی ودفاعی ہتھیاروں کی یونہی نمائش کریں، ان کو جانچیں پرکھیں، ان کے اوصاف اور خوبیوں کو معلوم

کریں اور اس کے لیے باقاعدہ مجالس منعقد کریں۔

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۙ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۔ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ۔ (ص:۳۱تا۳۳)

ترجمہ: جب اس کے سامنے عصر کے وقت اصیل اور عمدہ گھوڑے پیش کیے گئے تو اس نے کہا میں اس مال (گھوڑوں) کو محبوب رکھا، رب کے ذکر سے، حتی کہ وہ گھوڑے (واپس جاکر نظروں سے) چھپ گئے، پھر اس نے حکم دیا ان گھوڑوں کو میرے پاس واپس لاؤ اور وہ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (ہاتھ) مارنے لگے۔

(۹) حضرت سلیمان علیہ السلام کی سیاست بھی "دعوتی" تھی، آپ نے اپنے غیر معمولی معجزانہ وسائل کو محض کشور کشائی کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ ان کے ذریعے مخلوق خدا کو شرک کی اندھیر نگریوں سے نکال کر توحید کے نور سے آشنا کیا۔

یمن میں سبا کے آفتاب پرستوں کی ایک مضبوط حکومت قائم تھی، دربار سلیمانی کا ہدہد ان کی شوکت وشکوہ کا نظارا کرکے آیا اور اپنی رپورٹ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے پیش کی۔ مسلمان اہل سیادت کے لیے ناگزیر کے ہے کہ اطراف عالم میں ان کے جاسوس موجود ہوں اور وہ انہیں خدا کے دشمنوں کی نقل وحرکت سے آگاہ رکھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کب گوارا کرسکتے تھے کہ خدا کی زمین پر سورج کے سامنے سجدہ کرنے والوں کا شرکیہ نظام انسانوں کے گلے کا طوق بنا رہے۔ انہوں نے فوراً ملکہ سبا بلقیس کے نام خط بھیجا، وہ سلیمانی ہیبت جو دراصل ہیبت حق تھی کی تاب نہ لاکر تسلیم ہوکر حاضر کردی گئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت "واتونی مسلمین" کی پشت بھی زبردست سیاسی طاقت تھی، اس لیے پوری سلطنت کے دل حق کے سامنے جھک گئے۔ اسلام اپنی بنیاد میں دینِ دعوت ہے، اس کی سیاست اس کی دعوت کے لیے ہیں، جب سیاست وحکومت دعوتی فرائض فراموش کردے تو اپنی اہمیت اور وقعت کھودیتی ہے اور محض زمین کا بوجھ اور زندہ لاش رہ جاتی ہے۔

لسانی دعوت کی پشت پر جب مضبوط سیاسی طاقت ہو تو مسلمان "اَسْلِمْ تَسْلِمْ" [اسلام لے آؤ سلامتی پالوگے۔] کی اجمالی دعوت دیتا ہے اور مخاطب اگر فہم سلیم رکھتا ہو تو اس ایک لفظ "تَسْلِمْ" کی خوشخبری اس کا دل موہ لیتی ہے وہ کبھی مسلمانوں کے جنگی ہتھیاروں اور تکبیر سے سرشار لشکروں کو پورے جاہ وجلال اور شوکت وشکوہ کے باوجود جب رب کائنات کے حضور سربسجود دیکھتا ہے اوران کی زبانوں کو بھرپور مادی طاقت اور سیاسی جلال کے باوجود ایک رب ذوالجلال کے ذکر وتذکار سے مشک بار پاتا ہے تو اس کے قلب سے مادیت کے جعلی رعب ودبدبہ کا اثر کافور ہو جاتا ہے اور کبھی وہ دیکھتا ہے کہ قلت تعداد اور قلت وسائل کے باوجود مسلمان ہر انجام سے بے پروا میدان میں کود پڑتا ہے اور اتنی خوداعتمادی وبے جگری سے لڑتا ہے جیسے اپنے پشت پر کوئی بہت بڑی طاقت رکھتا ہو اور پھر وہ وسائل کی کمی کے باوجود میدان مار لیتا ہے ۔ مسلمان کا مخاطب جب اس کی اس طرز کی عسکری دعوت دیکھتا ہے تو اسے اپنے لشکروسپاہ اور مال وجاہ پر کاہ بھی نظر نہیں آتے اور وہ "اسلم" کی دعوت پر پورے شرح صدر اور قلبی قوت سے لبیک کہنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جس مخاطب میں مادیت کی جڑیں گہری ہوں اسے یہ حقیقت دکھانے کے لیے رب کی کبریائی کا نظارا میدان جنگ میں کروایا جاتا ہے، گھوڑوں کے سموں سے اڑتی چنگاریاں، سروں کی کھیتیاں کاٹتی تلواریں، اہل حق کے خلاف سینوں کا حقد وکینہ چیرتے نیزے اور تکبیر کے ہیبت ناک نعرے ہی وہ جراحی ہوتے ہیں جس سے کفروشرک اور مادیت میں ڈوبے قلوب کا آخری علاج ومداوا ممکن ہوتا ہے۔ جب ہیبت حق کو قلب کے روحانی راستے سے قبول کرنے سے انکار کیا جاتا ہے تو وہ مادی راستے سے خود کو قائم کرکے اپنا زور منواتی ہے۔ یہاں حجت تام ہو جاتی ہے، مخاطب کفر کی شوکت کو ٹوٹتا دیکھنے کے باوجود اس پر ایمان ترک نہیں کرتا تو یہ اس کا صوابدیدی اختیار ہوتا ہے لیکن مسلمان اہل سیادت اس کا پابند ہوتا ہے کہ وہ کفر کی اس شوکت کو قائم ہونے نہیں دے گا تاکہ "لیظهره علی الدین کله" اور " حتی لاتکون فتنة" کا طنطنہ قائم رہے اور انسانیت کے لیے دعوت حق کی قبولیت کی راہ میں اس عظیم فتنہ کا کلی انسداد ہو۔ یہی خلافت خداوندی ہے جو مسلمان اہل سیاست وسیادت سے مطلوب ہے۔ لیکن اس کے

لیے جس سیاسی قوت وشوکت وشکوہ کی ضرورت ہے جب تک وہ حاصل نہ ہو وہ خود کو اس کی تحصیل کی محنت کے پابند سمجھیں گے۔ آج کے عہد میں مسلم امت میں وحدت واتحاد، ذاتی اصلاح وتزکیہ، مادیت کے دین دشمن مظاہر سے کلی بیزاری، خدا کے وعدوں اور وعیدوں پر مضبوط یقین، جماعتی نظم وانصرام میں صبر وثبات، جوش کی بجائے ہوش، قرآن وسنت سے گہری ومستحکم وابستگی اور اسلام ہی کو اپنی اول وآخر ترجیح بنائے بغیر سیاست کی اس سطح اور خلافت خداوندی کے اس منصب کا خواب ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

(۱۰)سلطنت سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر ایک خدائے واحد کے سامنے تسلیم ہو گئی، ملکہ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کے عقد میں آئی، اس پورے عمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا لہجہ وکلام خدائے ذوالجلال کی خشیت سے معمور نظر آتا ہے، مادی سیاست اوتر نبوی سیاست کے حاملین میں یہی فرق ہوتا ہے کہ جب مادیت پرستوں کو اقتدار ملتا ہے تو وہ مخلوق خدا کو کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں، ان کے لہجوں سے رعونت ٹپکتی ہے، ان کی چال ڈھال بدل جاتی ہے۔ جب نبوی سیاست کے حاملین اس کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "صاحب حکومت انبیاء ورسل اور دنیوی بادشاہوں اور حکمرانوں کی زندگی میں ہمیشہ بین اور واضح امتیاز رہا اور رہتا ہے اول الذکر حضرات کی زندگی کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک گوشہ میں خدا کا خوف اور اس کی خشیت عدل وانصاف، دعوت وارشاد اور خدمت خلق نمایاں نظر آتے ہیں وہ کسی جائز موقع پر حاکمانہ اقتدار کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں تو اس میں نخوت وتکبر کی جگہ بغض فی اللہ نظر آتا ہے یعنی ان کا غصہ اپنے لیے نہیں، اپنے ذاتی مفاد کے لیے بلکہ خدائے برتر کے کلمہ کی بلندی کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف، حضرت داؤد وحضرت سلیمان علیہم السلام کی حیات طیبہ کا پورا دور اس کا شاہد عدل ہے اور مؤخر الذکر کی زندگی اور حیات کے ہر شعبہ میں ذاتی وقار، شخصی یا جماعتی یعنی

پارٹی تفوق و برتری کا مظاہرہ، زیر دستوں پر ظلم اساس و بنیاد کی طرح کار فرما نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ اول فرعون کے اس اعلان پر غور فرمایئے: انا ربکم الاعلی میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔ دوسرا کوئی نہیں۔ اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خطاب پر نظر کیجیے: ان لا تعلوا علی وأتونی مسلمین۔ مجھ پر بلندی نہ ظاہر کر اور مسلمان ہو کر میرے پاس حاضر ہو۔ دونوں جملوں میں حاکمانہ اقتدار کا مظاہرہ موجود ہے مگر فرعون کے اعلان میں خدا کے ساتھ سرکشی، مخلوق خدا پر ظالمانہ قہرمانیت اور دعوائے خدائی کے لیے انانیت جیسے امور صاف نظر آرہے ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے خطاب میں مخاطب کے مقابلے میں سربلندی کا اظہار ذاتی وقار اور شخصی سربلندی کے لیے نہیں بلکہ خدائے واحد کے ارشاد اور تبلیغ، اعلائے کلمۃ اللہ اور شرک سے بیزاری کے ساتھ دعوت توحید کے لیے کیا جارہا ہے اور یہی فرق ہے جو انبیاء علیہ السلام کی وراثت کے ذریعے ہمیشہ خلافت حقہ اور ملک عضوض یعنی دنیوی حکومت کے درمیان نمایاں رہنا چاہیے۔ (قصص القرآن، ج:۲، ص:۱۷۲)

تلک عشرۃ کاملۃ

حضرت سلیمان و داؤد علیہما السلام کی خلافت و حکومت سے مزید بھی بصائر و عبر سمجھے جاسکتے ہیں، لیکن سیاست و حکومت کے حوالے سے انہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل سیاست و قیادت کے لیے اسے مفید اور قابل عمل بنائیں آمین یارب العالمین

اسلامی نظام حکومت کے قرآنی اصول

اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں ایسی ہدایات عنایت فرمائی ہیں، جو مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ بات واضح ہے کہ اسلام دین ہے، یہ کوئی ازم یا نظام نہیں جس میں نظم اجتماعی کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کا کوئی متعین سانچہ وڈھانچہ جزئیات سمیت مہیا کیا گیا ہو۔ اسلام اقدار اور اصول فراہم کرتا ہے، ان کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے اور جب اس دعوت کے سانچے میں شخصیات ڈھلتی ہیں تو ان کی اجتماعیت سے ازخود ایک صالح نظام وجود میں آتا ہے۔ ذیل میں ہم ان اساسی چیزوں کو ذکر کرنے کی کوشش کریں گے جنہیں ایک اسلامی مملکت کی تشکیل میں اساسی اقدار کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

(۱) حاکمیت الٰہی:

اللہ تعالیٰ کائنات کا محض خالق ومالک اور رب ہی نہیں بلکہ اٰمر اور حاکم بھی ہے، اس نے انسان کو عقل کی نعمت سے نوازا، ارادہ وانتخاب اور کسب اعمال کی قوت بخشی اور کائنات کی بیشتر اشیاء اس کے تصرف میں دیں، لیکن یہ جملہ اختیار وتصرف عارضی ہے مستقل نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ ازلی کے تحت ہی ہے۔ انسان زمین پر خدا کا نائب وخلیفہ ہے، یہ حسن وقبح کا منبع نہیں، کہ اپنے اخذ وترک اور اختیار میں کلی طور پر آزاد ہو، اس کی پیدائش کا ایک متعین مقصد اسے دیا گیا، وہ اس مقصد کے تابع رہے تو عبد کہلائے گا اور اگر اس سے اعراض کرے تو خدا کا باغی وعاصی تصور ہو گا۔ جو امور انسان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں، خدا تعالیٰ ان میں حاکم تکوینی ہے اور جن پر انسان کو اختیار بخشا گیا ان میں خدا تعالیٰ حاکم تشریعی ہے، غرض حاکمیت مطلقہ اسی کا حق ہے، قانون ساز وہی ہے، انسان کے پاس انفرادی واجتماعی زندگی میں اس کے قانون کو انبیاء کرام کی تبیین وتشریح کے مطابق تسلیم کرنے کے

سوا کوئی چارہ نہیں۔ عقیدہ توحید کا یہی تقاضا ہے۔ مولانا اشرف سلیمانیؒ لکھتے ہیں:

> اسلام بیک وقت دین و دنیا کا جامع، معاد و معاش کے مصالح کا ضامن، ظاہر و باطن کی اصلاح کا کفیل، نظام اخلاق و معاشرت، معیشت و اقتصاد، سیاست و تدبیرِ مدن کے اعلیٰ اصولوں پر حاوی اور عدل و انصاف کے الٰہی ترازوؤں کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ قانون کا واحد منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا اصلاً نہ کوئی قانون بنا سکتا ہے نہ دے سکتا ہے، نہ اس میں تغیر و تبدل کا مجاز ہے جس طرح سَروری (Sovereignty) صرف ایک اللہ تعالیٰ کی واحد ذات کو زیبا ہے۔ اسی طرح قانون ساز (Legislater) اور "قانون دہندہ" (Law giver) بھی صرف ایک اللہ کی اکیلی ذات ہے۔ (مقالات اشرف، ج:۱، ص:۱۵۴)

ذیل کی آیات ہمارے اس مدعا کی کافی دلیل ہیں:

۱. "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ" (الاعراف: ۵۴) (یاد رکھو! اللہ ہی کے لئے پیدا کرنا اور حکم کرنا۔)

۲. اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ"۔ (الانعام: ۵۷) (فیصلہ کا اختیار کسی کو نہیں ہے، سوائے اللہ کے۔)

۳. مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۪ وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا" (کہف: ۲۶) (بندوں کے لئے اس کے سوا کوئی ولی و سرپرست نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔)

۴. يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (ال عمران: ۱۵۴) (وہ کہتے ہیں کہ اختیارات میں بھی ہمارا کچھ ہے۔ کہو، اختیار سارے کا سارا اللہ ہی کا ہے۔

۵. وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ (الرعد: ۴۱) (اللہ فیصلہ کرتا ہے اور کوئی اس کے

فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے۔)

۶. وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ:۳۰) (اور یاد کرو جب کہ تمہارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔)

۷. وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (الاعراف:۱۰)(ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے اس میں سامان زیست فراہم کیے۔)

۸. اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (الحج: ۶۵) (کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اللہ نے تمہارے لیے وہ سب کچھ مسخر کر دیا جو زمین میں ہے۔)

(۲)شریعت: قانون ملکی

انسان کو سیاسی واجتماعی زندگی کے لیے جو آئین و قانون درکار ہے وہ حاکم حقیقی، اللہ تعالیٰ نے اصولی حد تک انسانوں کو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے عطا فرمادیا ہے۔ انسانیت اس میدان میں اب خود کفیل ہے، اس کے واسطے کسی فرد، مجموعہ یا مجلس قانون ساز کو قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ وہ شریعت کے طے کردہ امور پر از سر نو قانون سازی کرے، یہ قانون قرآن مجید میں اور اس کے شارح حضرت محمد ﷺ کی سنت میں پوری طرح موجود ہ اور دستیاب ہے، اس قانون خداوند کی بلاچوں وچرا اطاعت ہر انسان کو کرنی ہے اور بے کم وکاست اس پورے مجموعہ قوانین کو اپنی پوری انفرادی واجتماعی زندگی میں نافذ کرنا ہے۔ وہ اس کے بجائے کوئی قانون بناسکتا ہے نہ اس کی پیروی کر سکتا ہے۔ اس شریعت سے اگر وہ انحراف کرے گا تو اپنی حقیقی حیثیت (خلیفہ اللہ) سے منحرف اور اپنے مالک سے بغاوت کا مجرم ٹھہرے گا۔ البتہ جن مسائل یا معاملات میں شریعت خاموش ہو یا نئے مسائل کے پیش نظر کوئی فروعی قانون بنانے کی ضرورت پیدا ہو جائے تو ان کے حل کے لیے دین متین کے دیئے گئے اصول وکلیات کی روشنی میں خاص شرائط کے حاملین وماہرین قرآن وسنت قانون سازی کر سکتے

ہیں لیکن ان کا قیاس واجتہاد بھی ظنی ہو گا اور قرآن وسنت میں مخفی منشا خداوندی کا محض مظہر سمجھا جائے گا۔ قانون شریعت اپنے اندر جامعیت رکھتا ہے، یہ ہر زمانے اور ہر خطہ کے لیے ہے، یہ عام انسانی قوانین کی طرح نہیں جن میں عدل کے پیمانے زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے جاتے ہیں، یہ حتمی واٹل ہے اور اس میں تغیر و تبدل یا نسخ کا اب کوئی امکان نہیں۔ مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ لکھتے ہیں:

"جس وقت اللہ تعالیٰ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر اپنے قانون کو نازل فرمارہے تھے اور اسے ان پر کھول رہے تھے اور ان سے اس کی عملی تشکیل کروا رہے تھے اور انعامات خداوندی کی تکمیل، احکام الہیہ اور قوانین ربانیہ کے نزول و تشکیل و تعمیل سے ہو رہی تھی اور انسانیت پر نعماءِ الٰہی کی تتمیم و سبوغ کا اعلان کیا جارہا تھا اور خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے " حیطہ نبوت" کو ابد تک مستمر فرما کر قیامت تک کے انسانوں کو ان کے لائے ہوئے احکام و قوانین کا پابند بنایا جارہا تھا اور دین کی ابدی تکمیل اور صحیفہ اسلامی یا مجموعہ قوانینِ اسلامی کی دائمی اور الٰہی حفاظت کی علی رؤس الاشھاد آواز لگائی جارہی تھی، اس وقت اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ بیسویں صدی یا اس کے بعد میں کیا ہو گا اور انسانیت کو اس زمانہ میں عدل و انصاف کے ترازو قائم رکھنے اور اپنے انفرادی و اجتماعی، اقتصادی و سیاسی، معاشی و عُمرانی، قومی و ملکی، بین الاقوامی و عالمی، دینی و دنیاوی معاملات کو باحسن الوجوہ انجام دینے کے لئے کن قوانین و نوامیس، احکام و دسائیر کی ضرورت ہو گی۔ اسلام کے علیم و خبیر خدا نے ہر زمانے کے جملہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے، فطرت انسانی کو خالق کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اور ہر طبقہ اور ہر قوم اور ہر نسل کے اجتماعی و انفرادی فوائد کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمیشہ کے لئے قرآن اور اسلامی قوانین کی صورت میں انسانی فلاح و صلاح کا وہ جامع و مانع دستور دے دیا جو ابد تک انسان کی معاش و معاد کی ضرورتوں پر حاوی اور ان کی دینی و دنیوی مصالح و فوائد کا واحد و تنہا ضامن و کفیل ہے۔ اس میں کوئی کجی نہیں اور کسی طبقہ یا گروہ اور نسل و قوم کی خاص

رعایت نہیں۔ وہ سب کا ہے اور سب کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون عدل و صدق کی وہ ربانی کسوٹی اور انصاف و داد رسی کا وہ سیدھا معیاری ترازو ہے جس نے انسان کو انسانی خود ساختہ قوانین کی بندشوں، نسل ولون کی رعایتوں، ملک و وطن کے مفاد پرستانہ شکنجوں، باطل ادیان کے ظلم وجور، برہمنیت و پاپائیت کے طغیان، ہر زمانے کے اکاسرہ و قیاصرہ، جبابرہ و فراعنہ کی تعدی و سرکشی سے انسانوں کو نجات بخشی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے عدل و احسان کو اسلامی قانون کی صورت میں بندوں پر کامل کر دیا۔ (مقالات اشرف، ج:۱، ص:۱۶۸)

ذیل میں چند آیات ہمارے مدعا کے کافی ووافی دلائل ہیں:

۱. وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (المائدۃ:۴۴) (اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔)

۲. اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (یوسف:۴۰) (حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔)

۳. وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِیْرًا۔ (النساء ۱۱۵) (اور جو کوئی رسول سے اختلاف کرے جب کہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی ہو اور ایمان لانے والوں کی روش چھوڑ کر دوسری راہ چلے، اسے ہم اس طرف پھیر دیں گے جدہر وہ خود پھر گیا اور اس جہنم میں جھونک دین گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔)

۴. فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔(النساء: ۶۵)(پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہر گز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ (اے نبی) وہ تجھے اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں بھی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر تسلیم خم کر لیں۔

۵. وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب:۳۶)(کسی مومن مرد اور کسی عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو اس معاملے میں ان کے لیے کوئی اختیار رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔)

(۳) شورائیت

خدا تعالیٰ کی حاکمیت کے تحت جب انسان اس کے دیئے ہوئے قانون شریعت کو انفس کے بعد آفاق پر نافذ کرنے کی پوزیشن میں آجائے اور اس کے مطابق ایک نظم اجتماعی قائم ہونے کے حالات پیدا ہوں تو اس نظم میں انتظامی فیصلوں کی بنیاد شورائی ہو گی۔ یہ مشاورت صاحب کردار اور صاحب الرائے اہل علم واہل حل وعقد شخصیات سے کی جائے گی، جنہیں انتظام ملکی کا تجربہ ہو، سیاست و سیادت کے قرآنی صفات سے بہرہ ور ہوں، قانون شریعت کے منشا کو سمجھتے ہوں یعنی صاحب علم و تقویٰ ہوں اور قبول حق میں حریص ہوں۔

پھر اسلامی شورائیت رائے شماری کا نام نہیں جیسا کہ آج کل سمجھ لیا گیا بلکہ یہ دلیل کی قوت پر فیصلہ کا نام ہے۔ شوریٰ پہلے سے طے شدہ بات پر رائے گننے کے لیے منعقد نہیں کی جاتی، بلکہ کسی ایجنڈا پر شریعت کے منشاء یعنی درست فیصلہ تک رسائی کے لیے آزادانہ بحث ومباحثہ ودلائل پر تبادلہ خیال

کے لیے منعقد کی جاتی ہے۔ تمام لوگوں کے آراء ودلائل سننے کے بعد امیر کو فیصلہ کا اختیار ہوتا ہے۔ امیر اس کا پابند نہیں ہوتا کہ وہ کثرت رائے کا اعتبار کرے بلکہ وہ قوت رائے کو دیکھ کر فیصلہ کرتا ہے، جبکہ رائے کی قوت پرکھنے کا معیار دلائل وشواہد کی قوت پر ہے اور اس کی کسوٹی قرآن وسنت اور تعامل وروایت ہے۔ بالفرض اگر شوریٰ میں کئی لوگوں کا موقف دلیل کے اعتبار سے کمزور ہو اور ایک شخص کی بات منشاشریعت کے موافق برہانی قوت رکھتی ہو تو اراکین شوریٰ کا اتنا منصف مزاج ہونا ضروری ہے کہ وہ دلیل کے سامنے اپنی رائے چھوڑ دیں اور مزاج شریعت کے جو بات زیادہ قریب اور ملک وملت کے مفاد میں بڑھی ہوئی ہے اسے شرح صدر سے قبول کرلیں۔ اسلامی شوریٰ میں رائے کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن امیر کے فیصلہ کے بعد تمام مخالف آرا مجلس شوریٰ کے اندر ہی انفرادی آراء کی حیثیت میں رہ جاتی ہیں اور ان مخالف آرا کی بنیاد پر فیصلہ کے خلاف متوازی فیصلہ کی گنجائش نہیں رہتی، یہی وجہ ہے کہ اسلامی شوریٰ میں اپوزیشن کا تصور نہیں ہوتا۔ یہیں سے اسلامی شورائیت مروجہ جمہوری شورائیت سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ جمہوری شورائیت میں کثرت رائے ہی فیصلہ کی بنیاد ہوتی ہے چاہے وہ دلیل وبرہان کے پلڑے میں رتی بھر اہمیت نہ رکھے، جبکہ اسلامی شورائیت کی بنیاد قوت رائے پر ہے چاہے وہ قوت شوریٰ کی جمہور کی آراء میں ہو یا ایک کی رائے میں، یا صرف امیر کی رائے میں۔ فیصلہ کن حیثیت اسی کی ہوگی۔ جیسے بدر کے قیدیوں میں حضوراقدس ﷺ نے حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما کی آرا کے ساتھ دو تہائی افراد ہونے کے باوجود حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کو معتبر سمجھا، جنگ خندق میں صرف حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی مدلل رائے پر خندق کھودی گئی، روم کی طرف حضور اقدس ﷺ کے مرض وفات میں روانہ لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کو روکنے یا کسی سن رسیدہ کو اس پر امیر بنانے کے حوالے سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جمہور کی رائے کو رد فرمایا۔ منکرین زکوۃ سے قتال کے معاملہ میں پوری شوریٰ کی رائے ابتداء حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے موافق نہ تھی، لیکن آپ کو اپنی رائے کی قوتِ دلیل پر اعتماد تھا، اس لیے تمام اراکین شوریٰ کو اس کی موافقت کرنی پڑی۔

ہاں! مباحات میں جہاں امیر کے پاس کسی فیصلہ میں ایک سے زیادہ جہات مساوی نوعیت کے ہوں تو وہاں صاحب علم و فہم ارکین شوریٰ کی بڑی تعداد کم تعداد والوں کے مقابلہ میں قوت دلیل کی علامت بن سکتی ہے۔ بذات خود یہاں بھی اکثریت کوئی دلیل نہیں بلکہ قوت دلیل کی ایک علامت ہے۔ عہد جدید کے جبر میں اگر نظریہ ضرورت کے تحت ملکی سطح پر اسلامی شورائیت کا یہ نظام عملاً برتنا مشکل ہو تو کم از کم جماعتی سطح پر حقیقی شورائیت کی بحالی کوئی مشکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:۳۸)

ترجمہ: اور مسلمانوں کا کام آپس کے مشورہ سے چلتا ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران:۱۵۹)

ترجمہ: اور ان سے ہر معاملے میں مشورہ کرتے رہو، پھر مشورے کے بعد جب تم نے عزم واردہ کر لیا تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

(۴)عدل وانصاف

انسان گروہی حیوان ہے، گروہ میں تنازعات امر یقینی ہے، اگر انسانوں میں رفع تنازعات کے لیے مربوط و منظم قواعد واصول نہ ہوں تو سوسائٹی میں امن وآشتی کا قیام ناممکن ہے، جس معاشرے میں عدل وانصاف قائم نہ ہو وہ انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہوتی، اس معاشرے اور جنگل میں فرق مشکل ہوتا ہے کہ کب کس طاقت ور کا زور چل جائے اور وہ کمزور کا گلا گھونٹ دے۔ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی وسیاسی بغیر عدل وانصاف کے اسلامی کہلانے کا مستحق نہیں۔ قرآن مجید وسنت رسول ﷺ نے رفع تنازعات کے لیے خود بھی اصول فراہم کیے اور ان اصول وکلیات کے نتیجہ میں ائمہ دین نے بھی فروعی احکام کا ایک بیش بہا ذخیرہ مہیا کیا ہے۔ شریعت نے بیشتر جرائم کی تفصیلات اور ان کی سزاؤں اور حدود کو خود ہی متعین کر دیا ہے اور کئی ایک کو حاکم وقت اور قاضی کی طرف تفویض کر کے تعزیری حیثیت میں رکھا ہے۔ یہ تمام سزائیں اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کا عجیب شاہکار ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ معیارات عدل وہی ہیں جو وحی نے مقرر کر دیئے ہیں ورنہ انسان کی عقل

نارساقطعاً اس قابل نہیں کہ وہ عدل کے حتمی پیمانے وضع کر سکے۔ اسلام کے نظام عدل کی اس سے بہترین مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں پر لازم قرار دیا ہے کہ اپنے بدترین دشمن کی دشمنی بھی انہیں عدل کے پیمانے ترک کرنے پر مجبور نہ کر سکے، بلکہ وہ اس کے ساتھ بھی عدل برتیں اور اس معاملے میں خدا خوفی قائم رکھیں۔ نیز شریعت مطہرہ نے لازم کر رکھا ہے کہ قیام عدل کے لیے شہادت و گواہی کو ہر حال میں قائم رکھیں اگرچہ اس کی زد خود اپنے اور اپنے والدین کے اوپر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

شریعت اسلامی میں قانون کی عمل داری ہر حال میں لازمی ہے، اس میں کسی کو استثنیٰ حاصل نہیں۔ قابل حد جرم زورآور سے سرزد ہو یا کمزور سے، جب وہ عدالتی دائرہ اختیار میں آ گیا تو پھر دونوں کو عدل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس معاملے میں کسی سفارش یا صاحب اقتدار کی معافی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آپ ﷺ نے ایک جرم کی سزا میں سفارش سامنے پر ارشاد فرمایا کہ اگر یہ جرم (بالفرض) فاطمہ بنت محمد (رضی اللہ عنہا) سے بھی سرزد ہوتا تو انہیں اسلام کے نظام عدل کا سامنا کرنا پڑتا۔

حضور اقدس ﷺ نے اطراف مدینہ میں بذات خود قاضی مقرر فرمائے تاکہ لوگوں کو بروقت اور فوری انصاف مہیا ہو، اسی طرح خلفائے راشدین کے دور میں بھی قضاۃ کا تقرر حکومت کی بنیادی اور کلیدی سیاسی ذمہ داری سمجھی جاتی۔ اس کے لیے قرآن و سنت کے گہرے علم و فہم، جرأت و حوصلہ مندی، تحمل و بردباری، زہد و تقویٰ، مجتہدانہ بصیرت اور تفقہ فی الدین کی حامل اور صائب الرائے شخصیات کا انتخاب کیا جاتا۔ جو کسی کے دباؤ یا لالچ میں آئے بغیر اپنی علمی و فقہی بصیرت اور خدا خوفی کی بنیاد پر باہمی نزاعات میں انصاف قائم کر سکیں۔

اسلامی عدلیہ اتنی آزاد ہوتی ہے کہ وہ صرف رعایا ہی کے تنازعات نہیں نمٹاتی بلکہ حکمرانوں کے خلاف شکایات سننے کی بھی مجاز ہوتی ہے اور مسلمان حکمران اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ عدالت کے روبرو حاضر ہو کر جواب دہی کرے۔

اس مدعا کو مندرجہ ذیل آیات مبارکہ بڑی وضاحت سے بیان کر رہی ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا.(النساء:۵۹)

(اطاعت کرو اللہ کی رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں ،پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو،اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔یہی ایک اچھا طریقہ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (المائدۃ:۸)

ترجمہ: اے ایمان والو!اللہ کے حقوق کو قائم رکھنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے رہو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ عدل نہ کرو، بلکہ انصاف کرو کیونکہ یہی بات تقویٰ کے زیادہ نزدیک ہے۔اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ۚ(النساء: ۱۳۵)

ترجمہ:اے ایمان والو!خوب قائم رہو انصاف پر، گواہ بنو اللہ کے لیے اور اگرچہ وہ گواہی خلاف ہو خود تمہاری ذات کے یا والدین اور رشتہ داروں کے۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (نساء:۵۸)

ترجمہ:اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل وانصاف سے فیصلہ کرو۔

(۵) قرآن کا قانون بین الاقوام

ایک اسلامی حکومت کو اقوام عالم سے کن بنیادوں پر تعامل و تعلق رکھنا ہے ،ذیل میں اس

حوالے سے چند اصولی اور بنیادی قرآنی ہدایات کو ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ دعوت مشترکات:

اس سے پہلے اس نکتہ کی وضاحت آگئی کہ اسلام دین دعوت ہے، یہ لوگوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نکال کر ایک رب وحدہ لاشریک کے در پر جھکانے کے منصب پر فائز ہے۔ اس کی داعیانہ حیثیت کا قیام افراد میں انفرادی سطح سے زیادہ اجتماعی سطح پر مطلوب ہے۔ عہد جدید میں اسلامی کہلانے والی حکومتوں نے دعوت کی جگہ مذہبی ہم آہنگی کو اہمیت دینا شروع کر دی ہے اور اس کے لیے دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اسلام مشترکات پر جمع ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ یاد رکھیں! قرآن مجید نے اہل کتاب کو جو "کلمة سواء بيننا وبينكم" پر جمع ہونے کی دعوت دی ہے، وہ باہمی مشترکات کو اسلام کے ممیزات و خصوصیات کی تفہیم کا زینہ بنانے کے واسطے ہے تاکہ دین حق کی مزایا و خصوصیات کو سمجھنے کی تمہید مہیا ہو، ان مشترکات کو لے کر داعی، مدعو کو یہ باور کرا سکے کہ ان مشترکات کے مقتضٰی کا کامل ربط اور تعلق اسلامی مزایا کے ساتھ ہے اور ان پر ایمان تبھی مکمل و مقبول ہو سکتا ہے جب ان کے مقتضایات یعنی اسلامی مزایا کو دل سے قبول کر لیا جائے۔ مشترکات پر جمع ہونے کی دعوت قطعاً اپنے ممیزات و خصوصیات سے دستبرداری کی قیمت پر نہیں تھی۔ بلکہ مسلمانوں سے تو ایسے مباحات میں بھی کفر کی مخالفت مطلوب ہے جو ان کا شعار بن چکے ہوں جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد اونٹ کا گوشت کھانا بدستور ترک کیے رکھا کیونکہ یہ اسلام میں کھانا کوئی واجب و فرض تو تھا نہیں دوسری طرف یہود سے مذہبی ہم آہنگی تھی، اس پر بھی تنبیہ ہوئی اور آیت "ادخلوا فی السلم كافة" اتری کہ اسلام میں پورا پورا داخل ہونے کے لیے صرف احکام اسلام پر ایمان و عمل کافی نہیں، بلکہ کفر کے شعائر میں ان سے ہم آہنگی کی بجائے اس کی مخالفت بھی مطلوب ہے۔

لہذا مسلمانوں کا نظم سیاسی اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے داعیانہ منصب کو قائم رکھے گا حتی کہ شوکت و طاقت مہیا ہونے پر وہ "عسکری دعوت" کا راستہ بھی اختیار کرے گا۔ ارشاد خداوندی ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم ۚ مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ (آلِ عمران:۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا، ان میں کچھ لوگ ایمان والے ہیں، مگر ان میں سے زیادہ تر نافرمان ہیں۔"

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔

(النحل:۱۲۵)

ترجمہ: آپ (ﷺ) اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی اور اچھی نصیحت کے ذریعے سے دعوت دیجیے اور ان سے مباحثہ کریں جو سب سے بہتر انداز میں ہو۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔

(اٰل عمران:۶۴)

ترجمہ: اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ اہل کتاب! آؤ ایک بات پر متفق ہو جائیں جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ اللہ کو چھوڑ ایک دوسرے کو اپنا رب قرار دیں، پھر اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دو کہ گواہ رہنا ہم تو فرمانبردار ہیں۔

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ کا نام و نشان باقی نہ رہے اور دین تمام تر خالص اللہ ہی کا ہو جائے، پس اگر وہ لوگ باز آ گئے تو بے شک اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

۲۔ معاہدات:

قرآن مجید نے امت کے مصالح کے پیش نظر مدعو اقوام سے معاہدات کی بھی اجازت دی ہے، یہ معاہدات دفاعی بھی ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ مدینہ ہجرت کے بعد یہود کے ساتھ میثاق مدینہ کی ایک شکل سامنے آئی گو کہ وہ مدینہ کی داخلی قوت تھی، لیکن مصالح کے پیش نظر خارجی طاقتوں کے ساتھ بھی ایسے معاہدات ہوسکتے ہیں جیسا کہ آغاز اسلام میں مختلف مشرک قبائل کے ساتھ حلیفانہ معاہدات ہوئے اور مشترکہ عسکری و دفاعی امور پر اتفاق رائے ہوا۔

اسی طرح یہ معاہدات جنگ بندی اور دیگر انتظامی امور پر بھی ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ میں ایسے کئی امور پر معاہدہ کیا گیا۔ یہ معاہدات ایسے امور میں باہمی تعاون اور تجارت پر ہوسکتے ہیں جن میں کسی منکر شرعی کا ارتکاب لازم نہ آتا ہو۔ لیکن تمام معاہدات میں اصولی طور پر یہ بات پیش نظر رکھنی ہوگی کہ اسلام کی بالادستی پر حرف نہ آئے، ان معاہدات میں امت کا فائدہ ہو اور ان میں ملت اسلامیہ سے خیانت کے خدشات کے وقت ان سے علی الاعلان دستبرداری کی ہمت ہو۔ الغرض یہ معاہدات پاؤں کی زنجیر نہ بنیں جو امت کو بے بس کر دیں بلکہ امت کے استحکام اور دعوت کے فروغ کا ذریعہ ہوں۔

عہد جدید میں اقوام عالم کے مابین جدید عمرانی معاہدات نے ایک طرف تو عالم اسلام کو کئی معاشی، عسکری اور سیاسی پابندیوں میں محصور کر رکھا ہے تو دوسری طرف ان میں سے بیشتر معاہدات اسلامی اصولوں سے دست برداری کی قیمت پر منوائے گئے ہیں، نیز فریق مخالف کی طرف سے ان کو بارہا سبوتاژ کیے جانے کے باوجود امت مسلمہ پر ایک جبر کے تحت انہیں مسلط رکھا جاتا ہے اور امت مسلمہ کے پاس جبر کے باوجود ان معاہدات سے انکار یا دست برداری کا کوئی آپشن نہیں ہوتا۔ یہ امت مسلمہ کے اہل دانش و اہل فہم کے لیے ایک سنجیدہ سوال ہے کہ اسلامی اصول واقدار کو قائم رکھتے ہوئے وہ ایسے معاہدات کی پاس داری اور عالم کفر کی جانب سے مسلسل جارحانہ رویوں کا دفاع کیسے کر سکتے ہیں؟ ان کے لیے کیا امکانات ہیں جنہیں بروئے کار لا کر وہ عہد وپیمان کے اسلامی مزاج پر

بھی قائم رہیں اور انہیں اپنے مفادات و وقار کا سودا بھی نہ کرنا پڑے۔ اس وقت کے عالمی تناظر میں امت مسلمہ کے پاس اس کا واحد حل یہی ہے کہ اپنی مستقل جغرافیائی شناختوں کو قائم رکھنے کے باوجود وہ باہم ایسے عمرانی معاہدے وجود میں لائیں، جن کی رو سے کوئی مسلمان ملک انفرادی حیثیت سے کسی بڑی طاقت سے معاشی، عسکری اور سیاسی معاہدات نہ کرے بلکہ ان میں عالم اسلام کے مشترکہ مفاد کو پیش نظر رکھیں، جبکہ باہمی تجارت، تعاون علی البر، دفاع اور مشترکہ مفادات کے لیے اکٹھ اور معاہدات ان کی سیاسی ترجیحات کا اولین حصہ ہو۔ اس طرح عالمی ساہوکاروں کے مقابلے میں ایسی متوازی قوت پیدا ہونے کا یقین ہے جس کے ساتھ اگر معاہدات ہوں تو پھر برابری کی سطح پر ہوں گے اور کوئی انہیں دبانے اور ان کا استحصال کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو گا۔ اس کے بغیر اسلامی سیاست میں معاہدات کے روح اور فلسفہ کو قائم رکھنے کی کوئی ممکنہ صورت فی الوقت نظر نہیں آتی۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ:۲)

ترجمہ: نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔(الکہف:۲۸)

ترجمہ: اور تو اطاعت نہ کر کسی ایسے شخص کی جس کے دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کی ہے اور جس کا کام حد سے گزرا ہوا ہے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا(بنی اسرئیل:۳۴)

ترجمہ: عہد وفا کرو یقیناً عہد کے متعلق باز پرس ہو گی۔

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ(التوبۃ:۷)

ترجمہ: جب تک دوسرے فریق کے لوگ تمہارے ساتھ عہد پر قائم رہیں گے تم بھی قائم رہو یقیناً اللہ پرہیز گاروں کو پسند کرتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا

اِلَیۡھِمۡ عَھۡدَھُمۡ اِلٰی مُدَّتِھِمۡ (التوبۃ:۴)

(مشرکین میں جن لوگوں کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا پھر تمہارے ساتھ وفا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے عہد کو معاہدہ کی مدت تک پورا کرو۔)

وَاِنِ اسۡتَنۡصَرُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ فَعَلَیۡکُمُ النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰی قَوۡمٍ بَیۡنَکُمۡ وَبَیۡنَھُمۡ مِّیۡثَاقٌ

(الانفال:۷۲)

ترجمہ: اور اگر (دشمن کے علاقے میں رہنے والے مسلمان) تم سے مدد مانگیں تو مدد کرنا تمہارا فرض ہے مگر یہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں دی جاسکتی جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَۃً فَانۡۢبِذۡ اِلَیۡھِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ۔

(الانفال:۵۸)

ترجمہ: اور اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت (بدعہدی) کا اندیشہ ہو جائے تو ان کی طرف پھینک دو (ان کا عہد) برابری ملحوظ رکھ کر یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَھَا (الاانفال:۶۱)

ترجمہ: اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ۔

۳۔ جہاد:

جہاد دراصل اسلام کا نظام امن عالم ہے، اسلام اس بات کا ببانگ دہل مدعی ہے کہ انسانیت کے لیے دنیوی اعتبار سے بھی وہی دستور حیات پریکٹیکل ہے جو حضور اقدس ﷺ لے کر آئے ہیں، لہذا اگر کوئی اس کے فروغ کے لیے خطرہ ہے یا اس نے اپنی ایسی شوکت قائم کر رکھی ہے کہ انسانیت کے لیے اس دین سے مستفید ہونے میں رکاوٹ ہے تو ہر دو صورتوں میں اسلامی حکومت اس کی پابند ہوگی کہ کفر کی اس فتنہ انگیز قوت وشوکت کو ختم کر دے اور اسے اسلام کے عادلانہ نظم اجتماعی تلے انسانیت کو زندگی گزارنے پر بزور آمادہ کر دے۔ اس کی آمادگی کی صورت میں اسے مذہبی آزادی ہوگی اور اس کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے ذمہ

ہو گی، اگر مسلمان اس میں کوتاہی کے مرتکب ہوں تو وہ عند اللہ اس کے جواب دہ تو ہوں گے ہی، انہیں اسلام کے نظم عدالت کے سامنے بھی جواب دہ ہونا پڑے گا۔

جہاد اپنے مقبوضات کی خلاصی، ظالم کے جور کے خاتمہ، مظلوم کی دادرسی، اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کچلنے اور اپنے دفاع کے بھی کیا جاتا ہے اور یہ مسلم حکمرانوں کی ایک شرعی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برا ہونے کے لیے انہیں ہمہ وقت تیار رہنے کا حکم ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ (البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: تم پر لڑنا فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے اور ممکن ہے تم ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور تمہارے لیے بری ہو۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا

(المائدہ:۳۳)

ترجمہ: جو لوگ اللہ ورسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی لٹکائے جائیں۔

۴۔ تعلقات عامہ

قرآن مجید غیر مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات عامہ کے لیے بھی اصول وضع کرتا ہے، اس اعتبار سے غیر مسلم ممالک کی دو کیٹگریز بنتی ہیں۔ ایک حربی ممالک ہیں، جو کہیں بھی عالم اسلام کے ساتھ حالت جنگ میں ہوں اور دوسرے ممالک معاہد ہوتے ہیں جن کے ساتھ امن معاہدات ہوں۔ ان دونوں کے ساتھ تعامل کے جدا جدا احکامات ہیں، دونوں کے شہریوں کی عالم اسلام میں قانونی حیثیت سے داخلہ کی اپنی صورتیں ہیں، ان کے جان ومال کے تحفظ کے حوالے سے شریعت کے مستحکم قواعد واصول ہیں۔ دونوں طرح کے ممالک میں مسلمانوں کی رہائش یا ان کے ساتھ تجارت کے بھی طے شدہ حدود وقیود ہیں۔ عہد جدید میں کون سے غیر مسلم ممالک کس کیٹگری سے متعلق ہے یہ

ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کا اثر مسلمانوں کے کئی فقہی احکام پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ جدید نظم ریاست میں غیر مسلم ممالک سے تعلقات عامہ کی فقہی بنیادوں کا تو یہ موقع نہیں لیکن اس میں بنیادی اصول یہی ہے کہ ان تعلقات سے ظلم میں معاونت نہ ہو، غاصبانہ طاقتوں کو تقویت نہ ملے، ان کو ایسے معاشی فوائد حاصل نہ ہوں جنہیں عالم اسلام کے خلاف استعمال کر سکیں، ان تعلقات سے انہیں عالم اسلام میں اپنے کفریہ افکار وعقائد اور تہذیب کے فروغ کے مواقع نہ ملیں، ان سے مسلمانوں کو دعوت دین کے مواقع بہم پہنچیں اور ملک وملت کے سیاسی و معاشی و تعلیمی مفادات کا حصول ہو۔ ان ممالک میں معاشی وفنی تعلیم کے لیے جانے والے مسلمان داعیانہ مزاج کے ساتھ جائیں اور وہاں سے آنے والے سیاسی، تعلیمی، معاشی وفود کے ساتھ داعیانہ بنیادوں پر ملنے ملانے کا ماحول ہو تو ملک وملت کے لیے بلند اہداف پر کام کے امکانات پیدا کیے جاسکتے ہیں۔

اصولی طور پر غیر مسلم سے تعامل و تعلق کے تین دائرے ہیں:

۱۔ موالات: قلبی دوستی و تعلق، یہ کسی بھی کافر کے ساتھ جائز نہیں۔

۲۔ مدارات: یعنی ظاہر داری، یہ ایسے کفار کے ساتھ جائز ہے جن میں دعوت کا کام کرنا مقصود ہو، یا وہ مہمان بن جائیں یا ان کے ملک میں مسلمان بطور اقلیت رہائش پذیر ہو۔

۳۔ مواسات: انسانی ہمدردی، یہ حربی کافر اور زندیق کے علاوہ ہر قسم کے کافر کے ساتھ درست ہے۔ زندیق اور حربی کافر کا مقاطعہ واجب ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنہ:۸)

ترجمہ: اللہ تم اس بات سے نہیں روکتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے ان کے ساتھ تم نیک سلوک اور انصاف کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۵۔ سفارت

بین الاقوامی تعلقات کے لیے سفارت بنیادی اہمیت رکھتی ہے، مکی دور میں صحابہ کرام کی دوبار حبشہ ہجرت اور وہاں اسلام کا فروغ صحابہ کرام کی کامیاب سفارت ہی نتیجہ تھا، اسلام کے آغاز میں جب مؤمنین کی تعداد چند نفوس پر مشتمل تھی، مشرکین کی کوشش کے باوجود حبشہ میں اپنے لیے سیاسی پناہ باقی رکھنا بھی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی کامیاب سفارت کاری کا نتیجہ تھا۔ اسلام میں سفارت عالمگیر ہے کیونکہ اسلامی دعوت پہنچانے کے لیے و سربراہان دول واقوام تک آنحضرت ﷺ نے اپنے سفراء ہی کے ذریعے خطوط روانہ کیے۔ آپ ﷺ نے سفیروں کے معاملہ میں بین الاقوامی قوانین کا احترام قائم رکھا، حتی کہ مسیلمہ کذاب کے سفیروں کا آپ ﷺ کے منہ پر کذاب کی نبوت کا اقرار جس کی سزا اسلامی قانون کے اعتبار سے قتل تھی، آپ نے یہ کہہ کر روک دی کہ اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کروادیتا۔

(۶) قرآن مجید کے اصول خارجہ پالیسی

ا۔ صلح پسندی:

قرآن مجید نے اسلامی اپنے دعوتی مقاصد کی تکمیل کے لیے صلح پسندی کو زیادہ اہمیت دی ہے اور جنگ کو ناگزیر صورتحال میں گوارا کیا ہے۔ لہذا اسلامی مملکت کی خارجہ پالیسی صلح پسندی کی ہونی چاہیے لیکن یہ اپنی خودی اور وقار کی قیمت پر نہ ہو۔ اسلام دب کر صلح کو پسند نہیں کرتا۔ حتی کہ اگر دشمن صلح پسندی کا ناجائز فائدہ اٹھائے تو اس کے ساتھ صلح توڑ دینے کا حکم ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الاانفال:۶۱)

ترجمہ: اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔

(الانفال:۵۸)

ترجمہ: اور اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت (بدعہدی) کا اندیشہ ہو جائے تو ان کی طرف پھینک دو (ان کا عہد) برابری ملحوظ رکھ کر یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

۲۔ مساوی سطح پر مسلمہ قوانین کا احترام

مسلمان اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ ممالک کے ساتھ خارجہ تعلقات میں اقوام عالم کے مسلمہ قوانین اور معاہدات کی پابندی کریں۔ ۶ ہجری میں حضور اقدس ﷺ نے صحابہ کرام کے ساتھ عمرہ کا سفر کیا، کفار مکہ کی طرف سے عمرہ کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالی گئی، طویل گفت وشنید کے بعد حدیبیہ کے مقام پر صلح ہوئی اس معاہدہ میں اگلے سال عمرہ کی قضا کے لیے آنا طے پایا، بعض صحابہ کو خدشہ ہوا کہ اگر آئندہ سال بھی مشرکین مکہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے ہمیں عمرہ سے روک لیا اور لڑنے بھڑنے پر آمادہ ہو گئے تو ذی قعدہ کا مہینہ اور حرم کا محترم مقام ہونے کے باعث ہم تو لڑ نہیں سکیں گے کیونکہ اس وقت کے عرب قوانین کے مطابق چار ماہ رجب ذوالقعدہ ذوالحجہ اور محرم میں جنگ و جدل ممنوع تھا اور اسی قانون کے تحت بحکم الٰہی مسلمانوں کا بھی یہی تعامل تھا تو اللہ تعالیٰ نے خارجہ پالیسی کا ایک بہترین اصول عنایت فرمایا کہ "والحرمات قصاص" ایسے قوانین جو بین الاقوامی سطح پر مسلمہ ہوں جب دو ریاستوں کا ٹکراؤ آجائے تو یہ نہیں کیا جاسکتا کہ ایک سے تو قوانین کے احترام کا مطالبہ ہو اور دوسرے کو کھلی چھوٹ دی جائے۔ قوانین کا احترام بدلے کی چیز ہے اگر دشمن احترام کرے تو ہم سے بھی احترام کی توقع رکھے لیکن اگر وہ احترام نہیں کرتا اور ان مسلمہ قوانین کو پامال کرتا ہے تو پھر ہم سے بھی ان کے احترام کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۔ (البقرۃ:۱۹۴)

ترجمہ: حرمت والا مہینہ، حرمت والے مہینے کے بدلہ میں ہے۔ اور سب حرمتوں میں برابری ہے۔ پھر جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی سختی کرو اس پر، جیسی کی زیادتی کی اس نے تم پر۔

۳۔ مذاکرات میں مساویانہ حیثیت قائم رکھنا

اقوام عالم سے جب بھی کسی مسئلہ پر مذاکرات درپیش ہوں تو ضروری ہے کہ اس میں کسی طرح کا دباؤ قبول نہ کیا جائے اور اگر دشمن دباؤ ڈالنے کی کوشش کرے تو قومی وملی وقار کو قائم رکھتے اسے آئینہ دکھایا جائے۔ بعض صحابہ کرام کی ایک سفر میں کچھ کفار سے جھڑپ ہوگئی تیر اندازی کا تبادلہ ہوا جس میں ایک کافر مارا گیا، یہ جمادی الثانی کی ۲۹ تاریخ تھی اور جھڑپ شام کے وقت ہوئی صحابہ کرام سمجھ رہے تھے کہ سورج غروب ہو کر ۳۰ جمادی الثانی شروع ہوگئی لیکن اتفاق سے رجب کا چاند نظر آ گیا تھا جس کی وجہ کفار کو پروپیگنڈے کا موقع مل گیا کہ لیجیے جی! مسلمان تو رجب میں بھی جنگ کر کے لوگوں کو مار رہے ہیں حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقررہ کردہ قانون ہے کہ اس ماہ میں جنگ حرام ہے اور تمام عرب قبائل اس کو مانتے ہیں اس مسلمہ قانون کی ان لوگوں نے خلاف ورزی کی۔ مسئلہ واقعی حساس تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان صحابہ سے ناراضگی کا اظہار کیا کہ ان کے انفرادی فعل سے ریاست کی پوزیشن کمزور ہوگئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جھڑپ میں کفار سے حاصل ہونے والا مال غنیمت بھی سرکاری خزانے کے لیے قبول نہیں کیا گویا ریاست نے اس جنگ اور اس کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے سے ایک طرح توقف اختیار کر لیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان صحابہ کرام کی معافی اتری، ان کا مال غنیمت قبول کیا گیا اور واضح کیا گیا کہ ان کا اقدام غلط فہمی کی وجہ سے تھا نیز اس میں خارجہ پالیسی کا ایک اہم اصول بیان ہوا کہ دشمن ملک سے گفتگو ہمیشہ برابری کے اصول پر ہو معذرت خواہانہ انداز میں نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کفار کا مذاکراتی وفد آپ سے پوچھ رہا ہے کہ اس احترام والے مہینے میں جنگ کا کیا جواز تھا تمہارے پاس؟ تو آپ کہہ دیں کہ اس مہینے میں جنگ کا واقعی جواز نہیں اور یہ بڑی غلطی اور گناہ کی بات ہے، لیکن لوگوں کو اللہ کے گھر سے روکنا، اللہ تعالیٰ کے آفاقی قوانین کا انکار کرنا، اہل مکہ کو ان کے گھروں سے ہجرت پر مجبور کرنا اس سے بھی بڑے گناہ ہیں، اللہ کی زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنا مسلمانوں کے اس قتل سے بڑا گناہ ہے۔ لہٰذا دشمن ممالک سے جب مذاکرات کا موقع ہو تو اسلام کا

خارجہ اصول یہ ہے کہ ذرا ان کو بھی آئینہ دکھایا جائے کہ خود تمہاری اپنی کیا پوزیشن ہے؟ ذرا اسے بھی دیکھیں کہ ہم سے جواب طلبی کے لیے پہنچ گئے ہیں اور سارا ملبہ ہم پر ڈال رہے ہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ (البقرۃ:۲۱۷)

ترجمہ: وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ حرمت کے مہینے میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ ان سے کہہ دیجیے کہ اس مہینے میں جنگ کرنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام میں نہ جانے دینا اور اس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر برا ہے اور فتنہ پھیلانا خونریزی سے بھی بڑا گناہ ہے۔

۴۔ عہد وپیمان کا احترام

اسلامی ممالک دیگر ممالک سے کیے گئے عہد وپیمان کے پابند ہوتے ہیں، اس میں خیانت کا ارتکاب شرعاً حرام ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرئیل:۳۴)

ترجمہ: عہد وفا کرو یقیناً عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔

وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (المومنون:۸)

ترجمہ: اور وہ اپنی امانتوں اور معاہدات کا پاس رکھتے ہیں۔

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا۔ (النحل:۹۱)

ترجمہ: اور اللہ کا عہد پورا کرو جب تم معاہدہ کرو اور قسمیں مضبوط کرکے نہ توڑو۔

۴۔ مظلوم کی حمایت:

ایک اسلامی مملکت اپنی خارجہ پالیسی میں مظلوم کی مدد ونصرت کو اولین حیثیت دے گا اور ظلم کے خلاف مظلوم کے شانہ بشانہ کھڑا ہوگا۔ اگر دو مسلمان طاقتیں باہم دست وگریبان ہوں تو ان میں

صلح کی کوشش کرے گا اور جو زیادتی کرے اس کے خلاف کھڑا ہو گا۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ (البقرۃ:۷۵)

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی آزادی کے لیے جنگ نہیں کرتے جو کہہ رہے کہ ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندے بڑے ظالم باہر نکال۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ۔ (حجرات:۹)

ترجمہ: اور اگر مومنین کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمایں صلح کرا دو، پھر اگر ان میں سے ایک جماعت دوسری پر زیادتی کرے تو تم اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ:۲)

ترجمہ: نیکی اور تقوی میں تعاون کرو اور گناہ زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

۵۔ غیر جانب داری کا احترام:

ایک اسلامی ملک کے اگر دوسرے ملک کے ساتھ تعلقات اس درجہ خراب ہو جاتے ہیں کہ خدانخواستہ نوبت جنگ تک پہنچ جاتی ہے تو دوران جنگ جو لوگ غیر جانبدار ہیں، ان کی غیر جانبداری کا پورا احترام کیا جائے اور انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ ارشاد خداوندی ہے:

إِلَّا ٱلَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَٰقٌ أَوْ جَآءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَٰتِلُوكُمْ أَوْ يُقَٰتِلُوا۟ قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَآءَ ٱللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَٰتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ ٱعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَٰتِلُوكُمْ

وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا۔(نساء:۹۰)

مگر وہ لوگ جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو، یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے دل تم سے یا اپنی ہی قوم سے لڑنے سے رکے ہوئے ہوں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا، پھر وہ تم سے ضرور لڑتے۔ پس اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور صلح کا پیغام بھیجیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر (حملے کا) کوئی راستہ نہیں رکھا۔"

۶۔ مخالفین کو کم سے کم رکھنے کی کوشش

ایک اسلامی حکومت کی کامیاب خارجہ پالیسی یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی بیرونی طاقت کو اپنے لیے خطرہ بننے نہ رہنے دے، اگر کوئی خطرہ ہے تو کوشش کرے کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ محاذ نہ کھولے، حضور اقدس ﷺ نے مشرکین مکہ سے ٹکراؤ کے وقت یہودی مدینہ کو معاہدات میں گھیرے رکھا اور جیسے ہی مشرکین سے معاہدہ ہوا، تب یہود کی خبر لی۔

۷۔ تالیف قلبی

اپنی خارجہ پالیسی میں مسلمان ملک اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایسے غیر مسلموں سے بھی تعلقات استوار رکھے گا اور ان کی تالیف قلبی کا اہتمام کرے گا، جن سے ملک وملت کے مفاد میں کسی طرح کا کام لیا جاسکے۔ زکوٰۃ کا ایک مصرف بھی "مؤلفۃ القلوب" ہے۔ اس سے مراد ایسے غیر مسلموں کا تعاون زکوٰۃ کی رقم سے کرنا ہے، جن کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی توقع ہو، یا جن سے وقار اور دبدبہ میں اضافہ ہو، یا جو امت کے مصالح کو بروئے کار لائیں اور اس کی مدافعت کریں اور اس کے دشمن پر نظر رکھیں۔ یہ مصرف امت کے سیاسی واقتصادی مصالح میں زکوٰۃ کے کردار پر بھی دلالت کرتا ہے گو کہ جمہور فقہا کے ہاں اسلام کو سیاسی غلبہ ملنے کے بعد سے یہ مصرف قابل عمل نہیں رہا۔

۸۔ دشمن پر معاشی دباؤ

ایک اسلامی ملک کی خارجہ پالیسی میں جہاں اقوام عالم میں اپنے لیے تجارتی معاہدات کے ذریعے

بہترین معاشی امکانات پیدا کرنا شامل ہے وہاں ملک وملت کے لیے خطرہ بننے والی اقوام وملل کی معاشی ناکہ بندی بھی اس پالیسی کا حصہ ہونا چاہیے۔ حضور اقدس ﷺ نے خود شام ومصر سے تجارت کو فروغ دیا لیکن مشرکین کے لیے شام وغیرہ سے تجارت میں رکاوٹیں پیدا کرنے کو باقاعدہ فوجی مہمات کا حصہ بنایا۔ اسی معاشی ناکہ بندی کے پیش نظر غزوہ بدر کا معرکہ لڑا گیا۔

۹۔ خبر رسانی یا جاسوسی

دشمن کی نقل وحرکت سے باخبر رہنے کے لیے دشمن ممالک میں اپنا جاسوسی نیٹ ورک قائم رکھنا بھی خارجہ دفاعی پالیسی کا حصہ ہونا چاہیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سیاسی اقدار میں اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے، حضور اقدس ﷺ بھی دشمن ممالک کے حالات سے واقفیت کے لیے معلومات حاصل کرتے رہتے تھے، آپ نے دوران جنگ دشمن کی فوج کی صورتحال معلوم کرنے اکثر جاسوس روانہ کیے۔ مکہ میں مشرکین کی نقل وحرکت پر بھی آپ ﷺ نے اپنے لوگوں کے ذریعے مسلسل نظر رکھی۔ تبوک کا اقدام بھی رومی لشکر کے حوالے سے رپورٹوں کے نتیجے میں کیا گیا۔

۱۰۔ اخوت کا فروغ

اسلام کی مثالی سیاسی ترتیب تو یہ ہے کہ پوری امت سیاسی اعتبار سے سلک وحدت میں جڑی ہوئی ہو لیکن جدید عالمی عمرانی معاہدات اور نظم ریاست میں مستقل جغرافیائی شناختوں کے ساتھ بھی ایک درجہ میں اخوت باہمی کا قیام نہ صرف ممکن بلکہ از حد ضروری ہے لہذا ایک اسلامی شناخت رکھنے والے ملک کی خارجہ پالیسی میں سرفہرست ترجیح اخوت اسلامی کا فروغ ہو اور اپنی قومی، لسانی اور وطنی شناختوں سے بڑھ کر امت بنے اور اسلامی شناخت کو ترجیح دی جائے، یہی شناخت اصل ہو اور باقی شناختیں محض تعارفی ہوں، ایک جسم واحد کے مانند ایک دوسرے کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھا جائے، عالمی مسائل میں مشترکہ مؤقف اختیار کیا جائے اور بحرانوں میں ایک دوسرے کے تعاون کو یقینی بنایا جائے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ (حجرات:۱۰) ترجمہ: بے شک ایمان والے بھائی بھائی ہیں۔

(۷) قرآن مجید کے اصولِ داخلہ پالیسی

اسلامی ملک کی داخلہ ذمہ داریاں کیا ہیں، اس حوالے سے قرآن مجید وسنت رسول نے جو اصول مہیا کرتا ہے وہ تقریباً زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہے، یہاں ہم چیدہ چیدہ چیزوں کو ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اقامتِ صلوٰۃ:

اسلامی حکومت کے اولین داخلی فرائض میں سے یہ ہے کہ وہ نمازوں کے قیام کا منظم ومربوط نظام قائم کریں، اس کے لیے مساجد قائم کرنا، ائمہ، مؤذنین اور خدام مقرر کرنا، نمازیوں کے لیے سہولیات بہم پہنچانا اور بے نمازیوں کی تادیب کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ نظام زکوۃ:

اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی ادائیگی و صرف کی منظم ترتیب بھی داخلہ پالیسی کا حصہ ہونی چاہیے۔ زکوٰۃ رعایا کے مالداروں سے وصول کرکے رعایا ہی کے فقرا پر خرچ کی جائے گی۔

۳۔ امر بالمعروف:

اسلامی حکومت کی داخلہ پالیسی ایسی ہو کہ اس میں معروف کی ترویج اور نفاذ بنیادی کاموں میں سے ہو، عوام کو معروف سے آگاہ کرنا اور معروفات کا ماحول بنانا، نیز معروف کو سرکاری حکم سے نافذ کرنا حکومتی فرائض میں سے ہے۔

۴۔ نہی عن المنکر:

اسلامی حکومت کی داخلہ پالیسی میں منکر کے انسداد کا پورا بندوبست ہونا چاہیے، معاشرہ میں منکر کے مواقع کا راستہ روکنا، منکر کے بارے میں آگاہی اور منکرات کو سرکاری حکم سے روکنا اسلامی حکومت کا بنیادی فریضہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ

الْمُنْكَرِ(الحج:۴۱)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، ایتاءزکوٰۃ کریں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

۵۔ مساجد اور تعلیمی اداروں کا قیام:

اسلامی حکومت کے بنیادی داخلہ فرائض میں سے مساجد کی تعمیر اور تعلیمی اداروں کا قیام بھی شامل ہے، ان میں دینی علوم کے مدارس بھی شامل ہے اور ملک وملت ودرکار فنی علوم کی تعلیم کا بندوبست بھی شامل ہے، ان کے لیے اساتذہ، ماہرین فن اور بہترین نصابات کی فراہمی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے، ملک کی تعلیمی وتربیتی پالیسی جتنی منظم اور مفید ہوگی، اتناہی رجال کار کی فراہمی آسان ہوگی۔ حضوراقدس ﷺ نے اگر ایک طرف مسجد نبوی قائم رکھے اس میں صفہ کی درسگاہ کی بنیاد رکھی، تودوسری طرف صحابہ کرام کو منجنیق سیکھنے، زبانوں کا علم حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں کے ذریعے مسلمان بچوں کو عصری مروجہ علوم کی تعلیم دلوانے کی مثالیں بھی قائم کیں۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۔(البقرۃ:۱۲۲)

ترجمہ: توکیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈرائیں، اس امید پر کہ وہ بچ جائیں۔

۶۔ معیشت وزراعت اور صنعت کو توجہ:

اسلامی حکومت کی داخلہ پالیسی میں ملک کے اقتصادی، زرعی اور صنعتی شعبوں کو منظم کرنے اور مفید تر بنانے کا عمل بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہونا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی معاشی وزرعی منصوبہ بندی، حضور اقدس ﷺ کے دفاعی آلات کے وضع کے لیے غیر مسلموں تک سے استفادہ، مدینہ منورہ میں مستقل تجارتی منڈی کا قیام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ باغوں

میں جاکر خود دست مبارک سے کاشتکاری ان شعبوں میں آپ ﷺ کی طرف سے اصولی رہنمائی کی بنیادیں ہیں۔

۸۔ انتظام ملکی:

اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ شہری تنظیم، رعایا کے بنیادی حقوق کی فراہمی اور مملکت کے جملہ انتظامی شعبوں کو معیاری طور پر قائم رکھنے کے لیے ایک منظم داخلہ پالیسی تشکیل دے۔ اس میں داخلی امن، بازاروں کا نظم نسق، انتظامی شعبوں کا قیام وانصرام سب کو کلیدی اہمیت دینے کی ضرورت ہوتی ہے، کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ کی نبوی تعلیم کہ تم سے ہر ایک نگران ہے اور اس سے اس کی رعایا کے متعلق سوال ہو گا۔ اس پالیسی کی بنیاد ہونی چاہیے۔

۹۔ میرٹ کا قیام:

اسلامی ملک کی داخلہ ذمہ داریوں میں ایک اہم کلیدی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انتظام ملکی میں میرٹ کو قائم رکھے، ایسی پالیسی تشکیل دے کہ غیر معیاری لوگ مناصب پر نہ آئیں، اس میں کوٹہ سسٹم اسلام کا مزاج نہیں، بلکہ جہاں کا جو شخص ملک وملت کے لیے بہترین خدمات انجام دے سکتے، منصب اس کے حوالے کرنا چاہیے، یہ ممکن ہے کہ کسی علاقہ میں رجال کار کی بہتات ہو اور کہیں قلت، لیکن کوٹہ کے تحت ایک علاقہ کے اہل افراد تو پیچھے رہ جائیں اور دوسرے علاقہ کے نااہل منصبوں پر براجمان ہو جائیں، اسے ملکی انتظام میں انتہائی خلل پیدا ہوتا ہے۔ اسلام صلاحیت وصالحیت کا قائل ہے، منصب ایک امانت ہے اور امانت اس کے اہل کے سپرد کرنا لازمی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (النساء:۵۸)

ترجمہ: اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے حوالے کرو۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَھَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا (النساء:۵)

ترجمہ: اپنے اموال جنہیں اللہ نے تمہارے لیے ذریعہ قیام بنایا ہے، نادان کے حوالے نہ کرو۔

۱۰۔ داخلی امن و دفاع :

ایک اسلامی ملک کی داخلہ پالیسی میں داخلی امن کا قیام اور ملکی دفاع اولین اہمیت کی حامل ہے، ایسے عناصر جو مسلمانوں کے بدخواہ ہوں، وہ مسلمانوں میں باہمی جھگڑوں کو فروغ دیتے ہوں یا بغاوت پیدا کرتے ہوں ، یا کسی بھی طریقے سے ملک کا امن خراب کرتے ہوں ان کی سرکوبی کا مناسب بندوبست ہونا چاہیے، اسی طرح جو لوگ کفر کے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہوں ان کا راستہ روکنے کی پوری تدبیر ہونا ضروری ہے کہ یہ سب داخلی امن کو سبوتاژ کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ نیز دین دشمنوں کے مقابلے میں پوری قوت تیار رکھنی چاہیے، اس میں اپنے دستیاب وسائل اور صلاحیتوں کو استعمال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیے، اتنی دفاعی تیاری پالیسی کا حصہ ہونی چاہیے جس سے دشمن کے دل و دماغ پر مسلمانوں کا رعب اور ہیبت طاری ہو۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

(الانفال:۶۰)

ترجمہ: اور کافروں کے مقابلہ میں جتنی قوت ہو سکے تیار رکھو اور جتنے گھوڑے باندھ سکو، تاکہ اس تیاری کے ذریعے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ڈراؤ۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ (التحریم:۹)

ترجمہ !اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے۔

(۸)رعایا کے حقوق

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارض مکہ مکرمہ کے لیے مانگی گئی دعا میں ان کے لیے امن، رزق فراخ اور تعلیم و تزکیہ کے لیے ہادی پیمبر کا سوال کیا گیا۔ اس سے کسی سرزمین کے باسیوں کی بنیادی ضروریات کا علم ہوتا ہے، کہ انہیں امن مہیا ہو، معیشت مستحکم ہو اور علم وہدایت کے مواقع پوری طرح میسر ہوں، نیز ان میں رکاوٹ بننے والے عناصر کا استیصال ہو۔ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام مسلم و غیر مسلم، مرد و عورت تمام کے درج ذیل بنیادی حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے:

۱- جان ومال کا تحفظ

"وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ "(بنی اسرائیل:۳۳)

ترجمہ: کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، حق کے بغیر قتل نہ کرو۔

"وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ "(البقرہ:۱۸۸)

ترجمہ: اپنے مال آپس میں ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ۔

۲۔ عزت وآبرو کا تحفظ:

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ (الحجرات:۱۱،۱۲)

یعنی کوئی گروہ دوسرے کا مذاق نہ اڑائے اور تم ایک دوسرے کو عیب لگاؤ، نہ ایک دوسرے کو برے لقب دو نہ تم میں سے کوئی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۔(الاحزاب:۵۸)

ترجمہ: اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا۔

اس آیت کی رو سے بہتان ایک اخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنی ہے بلکہ اس آیت کا تقاضا ہے کہ اسلامی ریاست کے قانون میں بھی جھوٹے الزمات لگانے کو (خواہ یہ فعل عوام کرے یا حکمران) جرم مستلزم سزا قرار دیا جائے۔

۳۔ نجی زندگی کا تحفظ:

لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (النور:۲۷)

ترجمہ اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں دخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔

لَا تَجَسَّسُوْا (الحجرات:۱۲)

ترجمہ: اور لوگوں کے بھید نہ ٹٹولو، ان کی جاسوسی نہ کرو۔

۴۔ مظلوم کو نالش و فریاد کا حق:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء:۱۴۸)

ترجمہ: اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہے

۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حق:

جس میں حکمرانوں کے غلط افعال پر تنقید کا حق بھی شامل ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(التوبۃ:۷۱)

ترجمہ: اور مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "میرے بعد کچھ لوگ حکمران ہونے والے ہیں جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔ (کنز العمال، رقم:۱۴۸۹۱)

"عن قریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تمہاری روزی ہو گی، وہ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو برے کام کریں گے۔ وہ تم سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی برائیوں کی تعریف اور ان کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرو۔ پس تم

ان کے سامنے حق پیش کرو جب تک وہ اسے گوارا کریں، پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔ (کنز العمال، رقم:۱۴۳۵۹)

۶۔ غیر مسلموں کو مذہبی عبادت کی آزادی:

غیر مسلموں کو اپنے دائرے میں مذہبی عبادات ورسوم کی آزادی ہوگی، تاہم انہیں اتنی چھوٹ نہیں دی جائے گی، جس سے مسلم معاشرہ پر منفی اثرات مرتب ہوں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرۃ:۲۵۶)

ترجمہ: دین میں جبر نہیں ہے۔

۷۔ نجی آزادی

ہر شہری اور گروہ شریعت اسلامیہ کے دائرے میں آزاد ہے، اور اس کا یہ بنیادی حق ہے کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی ثبوت اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر نہ کی جائے۔

اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (الحجرات:۶)

ترجمہ: اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے آئے تو تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو بے جانے بوجھے نقصان پہنچادو اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل:۳۶)

ترجمہ: کسی ایسی بات کے پیچھے نہ لگ جاؤ جس کا تمہیں علم نہ ہو۔

۸۔ مستحقین کو ناگزیر ضروریات کی فراہمی

مستحقین شہریوں کا یہ حق ہوگا کہ انہیں ناگزیر ضرورت زندگی کی فراہمی کا انتظام ہو۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات:۱۹)

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے محروم کا۔

۹۔ معاشرتی عدل

معاشرتی عدل کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ پیدائشی طور پر تمام انسان یکساں ہیں۔ رنگ و نسل وزبان وصنف ووطن کی بنیاد پر کسی کو حقیر وکم نہ سمجھا جائے، اس بنیاد پر کسی فرد، گروہ یا طبقے کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنا جائز نہیں۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ(الحجرات:۱۳)

ترجمہ: لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبلیوں اور قوموں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

لوگو! سن لو، تمہارا رب ایک ہے، کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی عربی پر کوئی فضیلت نہیں نہ کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضلیت ہے مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔ (رواہ البیہقی)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

لوگو! تمام انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں، ایک نیک اور پرہیز گار جو اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے اور دوسرا فاجر اور شقی جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے، ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ (رواہ الترمذی)

(۹) حکومت کے حقوق

۱۔ اچھے کاموں میں اطاعت:

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ (النساء:۵۹)

ترجمہ: اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔

وَلَا یَعۡصِیۡنَکَ فِیۡ مَعۡرُوۡفٍ (الممتحنہ: ۱۲)

ترجمہ: اور یہ کہ وہ کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی۔

۲۔ قانون کا احترام:

عامۃ الناس کے ذمہ لازم ہے کہ قانون ملکی کا احترام کریں اور ایسے کاموں سے بچیں جس سے نظم سلطنت میں خلل پڑے۔

وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِہَا (الاعراف:۵۸)

ترجمہ: زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح ہو جانے کے بعد۔

۳۔ تعاون علی البر:

کسی بھی نیک کام میں وحدت ملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی وسعت وامکان کے بقدر حکمرانوں کا معاون بنے۔

وَتَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰی ۪ وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَی الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ۪ (المائدہ:۲)

ترجمہ: نیکی اور تقوٰی میں تعاون کرو اور گناہ زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

۴۔ ہنگامی صورتحال میں ملک وملت کی دفاع کے لیے جان ومال کی قربانی پیش کرنا:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (التوبۃ:۴۱)

نکلو خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنی جان ومال سے، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

عصر حاضر میں انسانیت کو درپیش بحرانوں کی بنیادی وجہ

قرآن مجید نے سورۂ عصر میں انسانیت کو دائمی خسارے سے نکلنے کے لیے ایک دستور عمل فراہم کیا ہے۔ احیاء اسلام کے لیے کام کرنے والے افراد اور جماعتوں کے لیے اس دستور عمل کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر خسارے سے بچاؤ کی کوئی دوسری راہ موجود نہیں ہے۔ قرآن مجید نے جس چیز کو خسارہ سے تعبیر فرمایا ہے، اس کی کچھ حاضر شکلوں کو ہم زوال، ادبار اور بحران کہہ سکتے ہیں۔ انسانیت نے جب بھی سورۂ عصر میں مذکور نجات ابدی کے دستور یعنی انفرادی سطح پر ایمان و عمل صالح اور اجتماعی سطح پر تواصی بالحق و تواصی بالصبر یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی محنت کو فراموش کیا ہے اور اپنی فلاح و کامیابی کے خاکے کسی اور منہج (System) میں تلاش کیے ہیں تو اسے انفرادی، معاشرتی اور ریاستی وسیاسی سطح پر بدترین اخلاقی، روحانی اور باطنی بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس نے ایمانِ کامل اور عملِ صالح کی پامالی کا نتیجہ ایسے ہولناک زوال کی شکل میں پایا ہے جس کے آثار آج بھی عاد و ثمود اور اہل سدوم کی اجڑی بستیوں اور معذّب مقامات کی صورت میں درسِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو آج بھی انسانیت کو جس ہمہ جہت زوال، ادبار اور بحران کا سامنا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ خسارے سے خلاصی کا قرآنی دستور نہ صرف عملاً پامال ہے بلکہ اسے اعتقاداً بھی بڑی حد تک مسترد کر دیا گیا ہے۔

ایمان کامل یعنی خداوند قدوس کی ذات وصفات پر غیر متزلزل یقین بڑی حد تک مجروح ہے۔ مسلمان نے بے شک عبادت واستعانت کا ظاہری تعلق اللہ سے جوڑ رکھا ہے اور اس میں کسی اور جانب معمولی میلان کو وہ شرک سمجھتا ہے، لیکن "توحید" جو ایمان کا جزو اعظم ہے، غیر اللہ کے خوف،

غیر اللہ سے کام بننے، معمولی، وقتی اور ظاہری مفاد کی خاطر غیر اللہ سے متاثر ہو کر توحید کے تقاضوں کو فراموش کرنے سے پوری طرح آلودہ ہے۔ انسان اعتقاداً تو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا قائل ہے لیکن عملاً ظاہر و موجود کو پوجتا ہے۔ اس کی ساری وفاداریاں، ساری کاوشیں اور سارے قلبی و عملی دھیان مالی و جاہی مفاد سے وابستہ ہیں۔ اس کی عقل، قلب اور دل کی توجہات اور استعدادوں کا محور اسی مادی (مالی و جاہی) مفاد کا حصول ہے، اسے شیطان اور نفس کی شکل میں قوی محرک، عقل اور قلب کی صورت میں مضبوط آلاتِ فکر و فیصلہ اور مادی وسائل کی شکل میں آزاد میدان عمل میسر ہے۔ اس کی ساری زندگی نفس و شیطان کی انگیخت اور عقل و قلب کی منفی قوتوں کی کارکردگی میں مادی وسائل سے کھیلتے ہوئے گزر رہی ہے۔ انسان توحید کامل کے نقص اور اپنے ظاہری معبود "سرمایہ" و" اقتدار" سے شدتِ تعلق کے باعث حسد، رقابت، انانیت، تکبر، ظلم، بخل، شح، اسراف اور تبذیر جیسے رذائل کے گھیرے میں ہے۔ اس کا جذبۂ حبِ مال اور حبِ جاہ دوسرے انسانوں سے جینے تک کا حق چھیننے کے لیے اسے انفرادی سطح سے لے کر ریاستی سطح تک ابھار رہا ہے۔ ہر میدان میں مطمح نظر یہی ہے کہ سرمایہ میں بڑھوتری کیسے ہو؟ حکومتی ملازمین، تجار، خادم قوم کہلانے والے سیاسی، سماجی رہنما، سب اسی دوڑ میں شریک ہیں، ان کے ہاں اپنی خدمات کی انجام دہی اور اس کے نتائج ثانوی حیثیت کے حامل ہیں، اصل چیز سرمایہ میں لامحدود اضافہ کی خواہش ہے، انسان کی معاشرتی قدر و منزلت کا پیمانہ اب اس کی استعداد اور عملی کارکردگی نہیں بلکہ تنخواہ ہے، جس کے مالی وسائل جتنے زیادہ ہوں وہ اتنا ہی بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے، چاہے اس کی عقل و فہم صفر ہو۔ سرمایہ کے اس معبودی تصور کا نتیجہ ہے کہ آج کے نظم اجتماعی میں انسان محبوبِ حقیقی اور مخلوق سے محبت نہ کرنے کے بحران، خود اعتمادی کے بحران، دولت پر بے تحاشا لپکنے کے بحران، عاجزی و انکساری سے محرومی کے بحران، دوسروں کی تحقیر اور ان پر بالادستی کے احساسات کے بحران، انسانیت کی قیمت پر مفادات کے حصول کے بحران، شہرت و ناموری کے حصول کی تگ و دو کے بحران، دنیا کی خوبصورتی پر فداکاری کے بحران، اشتعال، جھنجھلاہٹ کے بحران، صلہ رحمی اور وفاداری کے خاتمے کے بحران، خاندانی نظام میں نفرت و کدورت

اور معمولی باتوں پر انتقامی جذبات ابھرنے کے بحران، سیاست، معاشرت اور مذہبی زندگی میں ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کے بحران اور دینی حیثیت سے مادی شہرت کے حصول جیسے سیکڑوں بحرانوں سے دوچار ہے۔ اس سارے عمل کے نتیجے میں انسانی زندگی دکھوں، پریشانیوں اور بے سکونیوں کی آماج گاہ بنی ہوئی ہے اور معاشرہ خاندانوں، محلوں، قوموں اور ملکوں کی سطح سے لے کر عالمی سطح تک تصادم اور خلفشار کا شکار ہے۔

ان بحرانوں کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہو گا کہ یہ سارے بحران انسان کے باطن میں موجود ایک زبردست خلا کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں کیونکہ جو کچھ انسان کے اندر ہوتا ہے اس کا مظاہرہ وہ خارج میں پیش کرتا ہے، اگر اندر کبر، دنیا کی محبت اور اقتدار کی خواہشات مچل رہی ہوں تو ظاہر سے بھی منفی کردار وجود میں آئے گا۔ باطن کا یہ ہولناک خلا ایمان اور عمل صالح (عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاقیات) کے پورے نظام کی پامالی کا نتیجہ ہے۔ خصوصاً ایمان و عملِ صالح کے تکمیلی پہلو یعنی ضروری تزکیہ و اصلاح سے محرومی اس باطنی بحران کا بڑا سبب ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج انسان اس داخلی بحران کے ادراک سے قاصر ہو گیا ہے اور وہ ان بحرانوں کے حل کے لیے قرآنی دستور و لائحہ عمل سے ہٹ کر راہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی قوم میں یہ بحران پیدا ہوتے ہیں تو اس سے ایک خاص قسم کی نفسیات تشکیل پاتی ہے اور اس سے ایک ایسا انسان جنم لیتا ہے جو "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" کا نمائندہ ہوتا ہے، اس کی فکر و نظر خسارے کی مادی ترتیبوں سے آگے نہیں بڑھتی، وہ سمجھتا ہے کہ میرے مسائل کا حل یہی مادی روش اور مادی سوچ و فکر ہے۔ ایسے انسان کی تصویر قرآن مجید نے بڑی واضح کر کے پیش کی ہے اور اس کا مزاج کھول کھول کر بیان کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کامل تزکیہ کے بغیر انسان کی تصویر کتنی بھیانک ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک صالح سماج اور صالح حکومت بغیر صالح فرد کے وجود میں نہیں آسکتی، اگر ہم چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ بحیثیت مجموعی ایک امت بننے کے لیے تیار ہو، اخوت کو وجود دیا جائے، وحدت کلمہ و وحدت فکر پیدا کی جائے اور اعلاء کلمۃ اللہ کی مؤثر محنت وجود میں لائی جائے تو اس کے لیے تمام جاری محنتوں میں تزکیہ یعنی ایمان و عمل صالح میں گندھے ہوئے فرد کی تیاری کا کام بنیادی اور اولین ترجیحات پر کرنا ہو گا۔ ورنہ تزکیہ سے محروم افراد کے ساتھ ہم یہ معرکہ کبھی سر نہیں کر سکتے۔

ہمارے اکابر کی تفاسیر میں اس موضوع کی آیت کے ذیل میں اس نکتہ پر کافی بحث ہوئی ہے، خصوصاً مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی دعوتی کتب میں ایسے ناکام اور خاسر انسان کے مذموم مزاج کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا تقی امینیؒ نے اپنی کتاب ''لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر'' میں بھی ایسے ناکام انسان اور اس کے مزاج سے پیدا شدہ اس کے مذہب کو واضح کیا ہے۔ ان اکابر کی تحریرات کو بنیاد بناکر قرآن مجید کی روشنی میں ''ایمان اور عمل صالح'' یعنی ''کامل تزکیہ'' سے محروم اور بحرانوں سے دوچار فرد کا ایک مختصر جائزہ پیش خدمت ہے:

(۱) تزکیہ یعنی اپنی اصلاح کا جذبہ نہ ہو تو اصول و نظریات پر عزم ویقین کی وہ روح باقی نہیں رہتی جو انسان کو سراپا عمل بناتی ہے اور اس کے رعب وہیبت کو قائم رکھتی ہے، نتیجتاً وہ دنیا کے دیگر نظاموں سے مرعوب ہو کر اپنی خودی اور تشخص کا سودا کر بیٹھتا ہے۔ قرآن مجید نے توحید سے محروم اور خدا کے مقابلے میں عبدیت وبندگی کا تعلق مادی قوتوں سے وابستہ کرنے والے مشرکین کی یہی خصلت بیان کی ہے کہ ان کو اپنے اصول و نظریات پر کوئی ثابت قدمی حاصل نہیں، ان کے دلوں میں شرک کے باعث رعب پڑ جاتا ہے۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُواالرُّعْبَ بِمَآاَشْرَکُوْابِاللّٰہِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا۔ (آل عمران:۱۵۱)

ترجمہ: وہ وقت دور نہیں کہ ہم منکرین حق کے دلوں میں تمہاری ہیبت بٹھادیں گے اور یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے خدا کے ساتھ ان ہستیوں کو بھی شریک ٹھہرالیا ہے، جن کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی۔

(۲) تزکیہ کے بغیر ایک بڑا بحران یہ درپیش ہوتا ہے کہ زندگی میں نظم ومرکزیت باقی نہیں رہتی اور حق کی اطاعت اور ملی اتحاد کا جذبہ کمزور سے کمزور تر ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً ایسے لوگ بڑی تعداد کے باوجود محکوم رہتے ہیں، ان کی زندگیوں میں مایوسی اور قنوط طاری رہتا ہے، یہ ذلت آمیز امن پر قناعت کر لیتے ہیں اور ایسی منتشر اکثریت پر منظم اقلیت ہمیشہ حکمرانی کرتی ہے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰی اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (المائدۃ:۲۲)

انھوں نے کہا: اے موسیٰ! بے شک اس سرزمین میں ایک جابر قوم ہے اور بے شک ہم ہرگز اس میں داخل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائیں، پس اگر وہ اس سے نکل گئے تو بے شک ہم داخل ہوں گے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ (المائدہ:۲۴)

ترجمہ: انھوں نے کہا: اے موسیٰ! بے شک ہم ہرگز کبھی بھی اس زمین میں داخل نہ ہوں جب تک وہ اس میں ہیں، آپ اور آپ کے رب جا کر لڑیں ہم تو یہیں بیٹھ رہیں گے۔

(۳) تزکیہ سے محرومی کے نتیجے میں دل کا استحکام اور اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد باقی نہیں رہتا، جس کی وجہ سے ہمت پست ہو جاتی ہے اور ضبطِ نفس اور پامردی کی روح فنا ہو جاتی ہے۔

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ وَیُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِیْنَ۔ (ابراہیم:۲۷)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جمنے اور مضبوط رہنے والی بات کے ذریعے جماؤ اور مضبوطی دیتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی اور نافرمانوں پر (جماؤ اور مضبوطی کی راہ) گم کر دیتا ہے۔

(۴) تزکیہ سے محروم انسان اوہام وخیالات کے بحران سے ہمیشہ دوچار رہتا ہے اور اسے قلبی ٹھہراؤ اور سکون نصیب نہیں ہوتا۔ یہ خیالی اور ظنی نفسیات اس قدر ترقی کرتی ہے کہ بالآخر عقائد تک کو متاثر کر دیتی ہے اور انسان خداوند قدوس کو اپنے اوہام وخیالات کے پیمانوں پر ماپنا شروع کر دیتا ہے۔

يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ۔ (آل عمران:۱۵۴)

ترجمہ: یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں عہد جاہلیت کے سے ظنون اوہام رکھتے ہیں۔

(۵) تزکیہ سے محروم انسان کو اکثر نفاق کے بدترین بحران کا سامنا رہتا ہے، اس کے ظاہر وباطن میں یکسانیت نہیں ہوتی، جب تک اس کے ذاتی اغراض ومفادات کا سوال ہوتا ہے، ان کی کاوشیں، چکنی چپڑی باتیں اور پھرتیاں دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ ان کے اقوال وافعال ہر طرح سے آراستہ دکھائی دیتے ہیں، لیکن جب ایثار وقربانی کا وقت آتا ہے یا ان کے کسی ادنیٰ مفاد پر ضرب پڑتی ہے، تو ان میں سہار اور برداشت کی طاقت بالکل نہیں ہوتی، لہٰذا ایسے موقعوں پر یہ کنی کتراتے ہیں اور ان کی اصلیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ خاسر انسان کے اس بحران کو قرآن مجید نے کس بلیغ پیرایہ میں واضح کیا ہے۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ط وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ط كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ط يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ط هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ (المنافقون:۴)

ترجمہ: جب آپ انہیں دیکھیں تو ان کی ظاہری حالت نہایت اچھی معلوم ہو، اگر وہ باتیں کریں تو آپ ان کی باتیں سنتے رہیں، گویا کندھے ہیں جو دیوار سے لگ کر کھڑے ہیں (سہار کی طاقت بالکل نہیں ہے) ہر چیخ وپکار کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ دشمن ہیں ان سے بچو۔

(۶) تزکیہ کے بغیر انسان کے سامنے واضح نصب العین اور مقصد نہیں رہتا، جس کی وجہ سے محنت ومشقت کے کام کرنے کی ہمت نہیں رہتی اور تن پروری اور عیش پرستی کی ذہنیت عام ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا بحران ہے جس سے قوموں کے وسائل لٹتے رہتے ہیں لیکن عیش کوشی اور کاہلی انہیں بامقصد جدوجہد اور ان وسائل سے کام لینے پر آمادہ نہیں کرتی۔ ایسے لوگ محنت ومشقت کے امور سے بھی جان چھڑاتے ہیں اور اسے اپنے خود ساختہ دلائل سے غیر مفید اور اپنے حق میں نقصان دہ باور

کراتے ہیں۔ اگر اس میں مجبوراً انہیں شامل ہونا پڑے تو کام چوری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہاں بغیر مشقت کے مالی وجاہی مفاد ملے تو اس کے لیے بلا تامل تیار ہو جاتے ہیں۔ غرض عافیت کوشی، مصلحت پسندی، سخن پروری اور حیلہ سازی کے جراثیم ان کے جزو زندگی بن جاتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ط اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا (التوبہ:۴۹)

ترجمہ: اوران میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے اجازت دیجئے (کہ گھر بیٹھا رہوں) اور فتنہ میں نہ ڈالئے، تو یاد رکھو کہ لوگ فتنہ ہی میں گر پڑے۔ (کہ راہ خدامیں جہاد کو جس میں دنیوی ودینی مفاد ہے اپنے لیے نقصان دہ اور فتنہ سمجھ بیٹھے۔)

لَوْكَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ

(التوبہ:۴۲)

ترجمہ: اگر تمہارا بلاواکسی ایسی بات کے لیے ہو جس میں قریبی فائدہ نظر آتا ہو اور ایسے سفر کے لیے جو آسان ہوتا تو یہ بلا تامل تمہارے پیچھے ہو لیتے لیکن انہیں راہ دور دکھائی دی۔ (اس لیے جی چرانے لگے۔)

(۷) تزکیہ کے بغیر انسان ذاتی اغراض اور مفاد کا غلام ہوتا ہے، وہ ہر جائز وناجائز طریقے سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے معمولی مفاد کی خاطر قوم وملت کے پہاڑ جیسے نقصان کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس کا اپنا مفاد محفوظ ہو تو اس کے لیے قومی وملی مصیبت کوئی درجہ نہیں رکھتی، بلکہ وہ خوش رہتا ہے اور اپنی دانشوری بگھارتا ہے کہ دیکھو! ہم کیسے اپنی تدبیر سے محفوظ رہے، چاہے وہ تدبیر قومی وملی مفاد کے کتنے ہی خلاف کیوں نہ ہو۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ۔ (توبہ:۵۰)

اگر تمہیں کوئی اچھی بات پیش آئے تو وہ انہیں بری لگے اور اگر کوئی مصیبت پیش

آجائے تو کہنے لگیں اسی خیال سے ہم نے پہلے ہی اپنے لیے مصلحت بنی کرلی تھی اور پھر گردن موڑ کر خوش خوش چل دیں۔

(۸) تزکیہ کے بغیر اعمال کی روح باقی نہیں رہتی، عبادات کے ذاتی وانفرادی ذوق وشوق کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اجتماعی عبادات اور ملی شعار کی ادائیگی بھی نہایت بے دلی وبے ذوقی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ نہ اس میں جذب وانجذاب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ دلجمعی اور اطمینان کی صورت ہوتی ہے۔ ان کی شرکت محض دکھاوے کی ہوتی ہے تاکہ اجتماعیت سے وابستہ ان کے مادی مفاد ضائع نہ ہوں، ورنہ درحقیقت انہیں اس اجتماع میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، نہ وہ اس میں ذکر وعبادت کے نصاب کو پورا کرنے کی کوئی فکر کرتے ہیں۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَخَادِعُھُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا (نساء:۱۴۲)

ترجمہ: اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں محض لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور برائے نام اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔

(۹) تزکیہ کے بغیر معاشرتی معاملات، سماجی روابط اور قومی اداروں میں کذب گوئی اور وعدہ خلافی سے کام نکالنے کو ہنر سمجھا جاتا ہے اور اس برائی کی شناعت (گندگی) دل سے نکل جاتی ہے، جس کی وجہ سے دل میں نفاق کی جڑیں پختہ ہوتی جاتی ہیں۔

فَاَعْقَبَھُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِھِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَہٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰہَ مَاوَعَدُوْہُ وَبِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْن (التوبہ:۷۷)

ترجمہ: ان کے دلوں میں نفاق (کاروگ) دائمی ہوگیا۔ اس تک کے لیے کہ اللہ سے ملیں اور یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ سے وعدہ خلافی کی اور نیز اس وجہ سے کہ وہ دروغ گوئی کیا کرتے تھے۔

(۱۰) تزکیہ سے محرومی کے نتیجے میں ایک بڑا بحران یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایمان ویقین کی دولت ہاتھوں سے نکل جاتی ہے، قوت ارادی مفقود ہوجاتی ہے اور عزم وہمت کے مواقع پر انسان ایسی روش

اختیار کرنے کی سوچتا ہے جس سے انتہائی بزدلی، دیوثی اور کمینہ پن کا ثبوت ملتا ہے۔

لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَیْهِ وَهُمْ یَجْمَحُوْنَ

(التوبہ:۵۷)

ترجمہ: (ان کے دلوں کے خوف اور نفرت کا یہ حال ہے کہ) اگر انہیں پناہ کی کوئی جگہ مل جائے یا کوئی غار یا اور کوئی چھپ بیٹھنے کا سوراخ، تو تم دیکھو کہ یہ فوراً اس کا رخ کریں اور حالت یہ ہو کہ گویا رسی توڑ کر بھاگے جارہے ہیں۔

(۱۱) تزکیہ کے بغیر خاسر انسان نفسانی کسک اور بے اطمینانی سے سکون حاصل کرنے کے لیے مادی تعیشات و آلاتِ لہو ولعب کا سہارا لیتا ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ معاشرہ میں اس حوالے سے آزادی، بے حیائی اور فحاشی عام ہو جائے تاکہ وہ آزادانہ ماحول میں اپنی نفسانی خواہشات پوری کر سکے اور اس پر کوئی عرفی و معاشرتی رکاوٹ نہ ہو۔ وہ اسے فنونِ لطیفہ کا نام دے کر جواز بخشتا ہے۔ اس کے لیے مالی وسائل لگاتا ہے اور لوگوں کو اس حوالے سے گمراہ کرنے کے لیے فن اور آرٹ کے نام پر نت نئے طریقے جاری کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (النور:۱۹)

ترجمہ: جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے کے خواہش مند رہتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّیَتَّخِذَهَا هُزُوًا۔ (لقمان:۶)

ترجمہ: اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو گانے بجانے کی چیزوں کی خرید و فروخت کرتے ہیں تاکہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے گمراہ کریں اور اسے ہنسی بنائیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

(۱۲) تزکیہ کے بغیر کامل اتباع دین کی روح ہمیشہ مفقود رہتی ہے۔ دین کے کسی شعبے سے جو

ظاہری وابستگی ہوتی ہے وہ محض نمائشی ہوتی ہے تاکہ اس تعلق کو دنیا کے حصول کے لیے آلہ کار بنایا جائے، اس نمائش میں فروعی اور معمولی باتوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور بنیادی درجہ کے فرض اور اصولی احکام کی طرف خاص توجہ نہیں ہوتی۔ بعض اوقات دین کے دیگر شعبوں سے بیزاری کی روش اتنی سنگین ہو جاتی ہے کہ تقابل کی فضا بن جاتی ہے اور دین کے بہت سے ضروری احکام سے نہ صرف یہ کہ منہ پھیر لیا جاتا ہے، بلکہ تحریف و تاویل اور انکار تک کی جسارت کر لی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ جس چیز کو دین سمجھا جارہا ہوتا ہے وہ دین نہیں ہوتا بلکہ ان کے اپنے جذبات ہوتے ہیں، جسے دین کے ناقص تصور کے پیرائے میں پیش کیا جارہا ہوتا ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ (البقرۃ:۸۵)

ترجمہ: کیا تم اللہ کی کتاب کے بعض حصے کو مانتے ہو اور کچھ حصے سے منکر ہو؟ (جو بعض احکام کو تو بجالاتے ہو اور بعض سے منہ موڑتے ہو۔)

(۱۳) تزکیہ کے بغیر ایک بڑا بحران یہ ہوتا ہے کہ انسان قومی و ملی وسائل کی منصفانہ تقسیم پر راضی نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا ہے کہ جائز و ناجائز جیسی صورت ہو مجھے مالی وسائل ملیں یا مجھے سہولت ملے، اگرچہ یہ دوسرے کے نقصان کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو، وہ معاشرہ میں ایسے منصفانہ اصولوں کی حامل شخصیات کا راستہ روکتا ہے، ان پر طعن و تشنیع کرتا ہے، ان کے کردار کو مشکوک بنانے کے لیے سازشیں کرتا ہے، اور اگر قوت میں ہو تو ان کو معطل کر کے چھوڑتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ (التوبہ:۵۸)

ترجمہ: اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں کہ غنائم تقسیم کرنے میں آپ پر عیب لگاتے ہیں (کہ آپ لوگوں کی رعایت کرتے ہیں) پھر حالت ان کی یہ ہے کہ اگر انہیں اس میں سے دیا جائے تو خوش ہو جائیں، نہ دیا جائے تو بس اچانک بگڑ بیٹھیں۔

(۱۴) تزکیہ سے چشم پوشی اس بحران کو بھی جنم دیتی ہے کہ امت بننے کے بجائے فرقہ بندی اور گروہ بندی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے، حق پرستی کی جگہ گروہ پرستی اور قوم پرستی آجاتی ہے، اچھائی اور

برائی کو جانچنے کے لیے اعتقاد و عمل معیار نہیں ٹھہرایا جاتا بلکہ معیار یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے گروہ میں داخل ہے یا نہیں، اگر وہ داخل ہے تو اچھا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی برے ہوں اور اگر نہیں داخل تو برا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ اس طبقاتی و گروہی مزاج میں انسان بڑی خیر سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ اسی مزاج کے باعث اسلام جیسی خیر سے محروم رہ گئے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ:۱۲۰)

ترجمہ: یہ یہود و نصاریٰ آپ سے ہر گز راضی نہ ہوں گے، یہاں تک کہ آپ ان کی ملت کی اتباع کریں۔

(۱۵) تزکیہ کی کاوشیں ماند پڑ جانے سے ایک بحران یہ پیدا ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ دل سخت اور بے جان ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے عبرت پذیری اور تنبیہ کی استعداد ختم ہو جاتی ہے اور انسان اپنی تباہ شدہ حالت پر قانع اور مطمئن بن جاتا ہے، پھر اس کے بعد آگے بڑھنے، اپنی حالت سنوارنے اور جاندار تمناؤں کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً۔

(البقرۃ:۷۴)

ترجمہ: پھر تمہارے دل سخت پڑ گئے ایسے سخت گویا پتھر کی چٹانیں ہیں بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت۔

(۱۶) افراد کا تزکیہ نہ ہو تو بحیثیت مجموعی قوم تعمیری کاموں کی طرف متوجہ نہیں رہتی، مطمح نظر صرف یہی ہوتا ہے کہ معاشرہ میں کسی طرح اپنی بالادستی اور علمی دبدبہ کا احساس قائم ہو، اس کے لیے ہر گروہ دوسرے کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے اور اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے، یہ آویزش سیاسی سطح پر بھی ہوتی ہے اور مذہبی سطح پر بھی۔ جن خطوں میں ایسے سیاسی گروہ برسر اقتدار ہوں، وہاں قومیں غلامی کی راہ پر چل پڑتی ہیں اور جن مذہبی طبقات میں یہ سوچ شدت سے کارفرما ہو وہاں فروعی اختلافات پر بھی خوں ریز جنگیں برپا ہو جاتی ہیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ (البقرہ:۱۱۳)

ترجمہ: یہود کہتے ہیں کہ عیسائی حق پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہود کے پاس کیا دھرا ہے؟ ایسی ہی بات ان لوگوں (مشرکین) نے بھی کہی جو (الہامی کتابوں کا) علم نہیں رکھتے ہیں۔

(۱۷) تزکیہ کے بغیر قومی و جماعتی جذبہ ختم ہو جاتا ہے، خلوص و للّٰہیت سے دین کا کام کرنے والے افراد پر اپنے زمانے کے مروجہ گھٹیا محاورے چسپاں کیے جاتے ہیں، تاکہ ان کی مثبت کاوشوں کی تصویر گھناؤنی پیش ہو سکے اور دین دشمن منفی سرگرمیوں کا فروغ ہو۔ جیسے عصر حاضر میں قدامت پسندی، دقیانوسیت، انتہا پسندی اور دہشت گردی کی خود ساختہ اصطلاحات سے بہت سے اہم دینی کاموں اور کاوشوں کی قدر کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (التوبۃ:۷۹)

ترجمہ: جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خوش دلی سے خیرات کرنے والے مؤمنین پر (ریاکاری) کا عیب لگاتے ہیں اور جن مؤمنوں کو اپنی محنت و مشقت کی کمائی کے سوا اور کچھ میسر نہیں (اور اس میں سے بھی جتنا نکال سکتے ہیں راہ حق میں خرچ کر دیتے ہیں) ان پر تمسخر کرنے لگتے ہیں۔ دراصل اللہ کی طرف سے خود ان پر تمسخر ہو رہا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

(۱۸) تزکیہ سے فراموشی قومی سطح پر ایک اور بڑے بحران کو جنم دیتی ہے کہ تزکیہ سے محروم مقتدر قوتیں اجتماعی سطح کے اداروں کو دانستہ یا نادانستہ دین دشمن قوتوں کی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ ان اداروں سے چار قسم کے منفی کام وجود پذیر ہوتے ہیں۔ ان اداروں سے

مسلمانوں کے جسمانی نقصان اور حذر کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ مخلص مسلمانوں کی مثبت دینی کاموں کی راہ بند کرنے اور انہیں مختلف سازشوں کے ذریعے حق سے باز رکھنے کی کوششیں ہوتی ہیں حتیٰ کہ جعلی مقدموں میں گھیرنے اور قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ ان اداروں سے ایسا لٹریچر تیار ہوتا ہے اور ایسی دعوت دی جاتی ہے جس کا مقصد لوگوں کو دین سے انکار پر آمادہ کرکے کفر کی وادی میں پھینکنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے تبلیغی مشن تیار کیے جاتے ہیں، سیمینار منعقد ہوتے ہیں اور اسلامی قوانین و اقدار کے خلاف فضاء ہموار کرکے طاغوتی افکار کو اپنانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہ ادارے اسلامی معاشرے میں اپنے ہمنوا تیار کرکے اور نئے نئے گمراہ کن افکار گھڑ کر فرقہ واریت کو فروغ دیتے ہیں۔ ان کا مقصدِ وحید یہ ہوتا ہے کہ نوجوان اپنے اکابر کی تعلیمات سے برگشتہ ہوں۔ ان میں خود رائی پیدا کرکے "روایت" کو چیلنج کرنے کا کام لیا جائے اور تسلسل و تواتر سے امت کو ملنے والے متفقہ عقائد و احکام کو مشکوک بنا کر نئے مکاتب فکر پیدا کیے جائیں۔

ان اداروں کا ایک بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کفریہ طاقتوں اور حربی قوتوں کے لیے "اڈوں" اور کمین گاہوں کا کام دیں۔ تزکیہ سے محروم "مسلمان" حربی کفار کو اپنے ادارے "نظریاتی" اور "عسکری" اڈوں کے طور پر فراہم کرتے ہیں جہاں بیٹھ کر کفار حقیقی مسلمانوں کے خلاف اپنی یلغار کو تقویت دیتے ہیں۔ ایسے لوگ ان منفی مساعی کے لیے قوم کو "اعتماد" میں لیتے ہیں اور قسمیں کھاتے ہیں کہ کفر کے ساتھ اس ساری "ہم آہنگی" میں ہمارے پیشِ نظر ملکی و قومی بھلائی ہے، ہم نے قوم و ملک کے مفاد کو سامنے رکھ کر ہی یہ فیصلے کیے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اپنی بات اور قسموں میں بالکل جھوٹے ہیں، ان کے پیشِ نظر "قومی" نہیں "ذاتی" مفاد ہیں۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَى وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ۔ (التوبۃ:۱۰۷)

ترجمہ: اور جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد بنا کر کھڑی کی کہ (۱) نقصان پہنچائیں،

(۲)کفر کریں، (۳)مؤمنوں میں تفرقہ ڈالیں(۴)اور ان لوگوں کے لیے ایک کمین گاہ پیدا کریں جو اب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑ چکے ہیں، وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں۔

(۱۹)تزکیہ سے محروم قوموں سے دین و دنیا میں آگے بڑھنے کے واسطے تحقیق و تنوع کی صلاحیت چھن جاتی ہے۔ وہ جمود کا شکار ہو کر احساس و شعور کی طاقت کھو بیٹھتے ہیں۔ المیہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے جمود کو حق پر ثابت قدم ہونے کا نام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسی جمود زدہ قومیں تعیشات میں گھر کر دیکھتی ہی رہ جاتی ہیں اور دنیا کے اقتدار و شکوہ پر باطل طاقتیں قبضہ کر لیتی ہیں۔ یہ جمودِ قلبی "حق پر ثابت قدمی" نہیں بلکہ ذلت و خواری کا سبب ہے۔ اس سے قومیں اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہیں۔ ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تحقیق و تنوع اور جبلی قوتوں کے پردوں کو توڑ کر ان کا درست استعمال "حق پر ثابت قدمی" اور قوموں کی زندگی کی علامت ہوا کرتا ہے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ (البقرۃ:۸۸)

جیسے کافر کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے محفوظ ہیں۔ (یعنی انہیں حق پر ثبات پوری طرح حاصل ہے، مزید تحقیق و تلاش اور تنوع کی کوئی حاجت نہیں ان کو حق پر تو قطعاً ثبوت حاصل نہیں) بلکہ ان پر کفر کی وجہ سے اللہ کی لعنت ہے۔

(۲۰)تزکیہ سے محرومی انسانی زندگی میں توہمات کے بحران کو بھی جنم دیتی ہے۔ حقائق سے نظریں پھر جاتی ہیں۔ جادو ٹونے، ٹوٹکے اور وہمی و خیالی چیزیں نگاہوں میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔ زندگی کے معمولات کو حقائق اور محنت و مجاہدہ کی بنیاد پر طے کرنے کے بجائے جادو ٹونوں پر طے کرنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ سفلی عملیات اور ان کی تاثیر کو اس درجہ اہمیت دی جاتی ہے کہ ہر بیماری اور مصیبت کو ان سے جوڑا جاتا ہے اور حقائق نظروں سے پوری طرح اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس سے ایسی توہم پرستانہ نفسیات کی افزائش ہوتی ہے جس کے ہوتے ہوئے انسان زندگی کے معمولی کاموں کو حقیقی پیمانوں پر نہیں ناپ سکتا چہ جائیکہ وہ سماج و ریاست میں عزیمت و جہاد کا مظاہرہ کر

سکے۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ (البقرۃ:۱۰۲)

ترجمہ: اور ان لوگوں نے جادو گری کے ان مشرکانہ عملیات کی پیروی کی، جنہیں شیطان حضرت سلیمانؑ کے عہد سلطنت کی طرف منسوب کر کے پڑھا کرتے تھے۔

(۲۱)تزکیہ سے محروم انسانی زندگی میں "خوف" کا بدترین بحران جنم لیتا ہے، خوف یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت اس بات کی فکر رہے کہ کہیں میرے مفادات ضائع نہ ہوں۔ خوف کا شکار انسان مزاحمت کے وقت اس نفسیات سے اس قدر مغلوب ہوتا ہے کہ بزدلی اور بے دلی سے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور عزم و ہمت کا مظاہرہ قطعاً نہیں کر پاتا۔ "خوف کی نفسیات" کا شکار گروہ ناگزیر مزاحمت و مدافعت کے لیے بھی ایسے ذرائع تلاش کرتا ہے۔ جہاں وہ اور اس کا مال محفوظ ہو۔ یہ گروہ متحد نظر آتا ہے لیکن در حقیقت ان کے دلوں میں تشتت و افتراق (نااتفاقی) ہوتا ہے۔ جوں جوں مزاحمت بڑھتی ہے ان کے باہمی اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ط بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ط تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ط (الحشر:۱۴)

ترجمہ: یہ لوگ تم سے نہ لڑ سکیں گے، ہاں مگر محفوظ بستیوں میں رہ کر یا دیواروں کے اوٹ سے۔ ان کی لڑائی آپس میں سخت ہوتی ہے تم ان کو مجتمع سمجھتے ہو۔ حالانکہ ان کے دل جدا جدا ہیں۔

(۲۲)تزکیہ سے محرومی اکثر فرد کو دین کی آفاقی محنتوں پر آمادہ ہونے نہیں دیتی، وہ پوری طرح "گرا ہوا انسان" بن کر رہنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔ تجارت، ملازمت، اہل و عیال اور خاندان کے تقاضے زندگی کا ایسا محور بنتے ہیں کہ دین کے لیے جدوجہد، سفر، قربانی ناقابل برداشت بار محسوس ہوتا ہے۔ نتیجتاً ایسے لوگوں میں کم ہمتی، تساہل، عافیت کوشی، مصلحت پسندی اور سست روی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کسی دینی تحریک یا مہم میں شرکت کی جرأت و ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ (الفتح:۱۱)

ترجمہ: اب کہیں گے تم سے پیچھے رہ جانے والے گنوار کہ اپنے مالوں اور گھر والوں کے کام میں لگے رہ گئے۔ اپنی زبان سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے۔

(۲۳)تزکیہ سے محرومی کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ اللہ والے اور اہل حق ذلیل وخوار معلوم ہوتے ہیں اور ان سے دینی رہنمائی حاصل کرنے کو عار سمجھا جاتا ہے۔ اگر انہیں کبھی اس طرف متوجہ کیا جائے تو تکبر سے دوچار جملے کس دیتے ہیں۔ اور حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ اہل حق کی مجالس اور اجتماعات سے دور رہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (المنافقون:۵)

ترجمہ: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمہارے لیے اللہ کا رسول مغفرت کی دعا کرے تو وہ اپنے سروں کو موڑ لیتے ہیں اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ تکبر کرتے ہوئے رکتے ہیں۔

(۲۴)تزکیہ کا بحران قوموں کی اجتماعی زندگی میں خواہشات کی پیروی اور بلند وعالی اہداف ومقاصد سے غفلت پیدا کر دیتی ہے۔ لوگ معمولی خواہشات پر مرمٹتے ہیں، ان کی کوششوں کا محور عمدہ کھانے، زرق برق پوشاک، عورتیں، بچے اور ان کے اونچے مادی مستقبل کے خواب، مال ودولت، جائیدادیں، بہترین سواریاں اور آرائش وزیبائش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اٹھتے بیٹھتے یہی ان کا موضوع سخن ہوتا ہے اور اسی کے تگ ودو میں ان کے صبح وشام کٹتے ہیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۔ (آل عمران:۱۴)

ترجمہ: لوگوں کے لیے عورتوں سے خواہشات کی اور بیٹوں کی اور سونے اور چاندی کے خزانوں کی اور نشان زدہ گھوڑوں کی اور مویشیوں اور کھیتی باڑی کی محبت خوش نما بنادی گئی ہے، یہ (سب) دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔

(۲۵) تزکیہ سے محروم معاشروں میں اتفاق واتحاد اور وحدت فکر و نظر کا شدید فقدان ہوتا ہے، ایسے معاشرے ایک دوسرے کو برداشت کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، ان میں صبر و تحمل اور حلم وبردباری نہیں ہوتی، یہ معمولی باتوں پر ایک دوسرے کو کاٹ کھاتے ہیں، لڑتے بھڑتے ہیں، مرتے مارتے ہیں، الزامات واتہامات کے سہارے جیتے ہیں۔ اپنا اثر جمانے اور مخالف کا اثر توڑنے کے لیے ہر فریب اور جھوٹ کو کام میں لاتے ہیں، یوں ان کی ہوا اکھڑ جاتی ہے، نہ ان کو ثبات قدمی ملتی ہے، نہ ثبات قلبی۔ نتیجتاً ان کے پاس زندگی کی دوڑ میں کچھ کر گزرنے کا کوئی منصوبہ نہیں ہوتا اور یہ غیروں کے دست نگر رہ جاتے ہیں۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ (الانفال:۴۶)

ترجمہ: اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول ﷺ کا اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور ثابت قدم رہو۔ یقیناً اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

(۲۶) تزکیہ سے محروم افراد کی محنتوں اور کاوشوں کا بنیادی ہدف مال ہوتا ہے، یہ مال جمع کرتے ہیں اور اپنی عیش وعشرت اور پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے ہر باطل طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ قومی وسائل لوٹتے ہیں، ماتحت ہوں تو چوری کرتے ہیں، بالادست ہوں تو ڈاکہ ڈالتے ہیں، شرافت کا لبادہ اوڑھ لیں تو ٹیکس کے نام پر بٹورتے ہیں اور تجوریاں بھرتے ہیں، بھلے اس کے نتیجے میں ملی و قومی تباہی کی جو شکلیں پیدا ہوں اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جب انہیں اس مال کو ان کے مطلوبہ

مصرف میں لگانے یا ملی و قومی مفاد میں خرچ کرنے پر آمادہ کیا جائے تو ان پر موت پڑتی ہے۔ حالانکہ جب اس مال کی معاشرے میں گردش رہتی ہے اور منصفانہ تقسیم ہوتی ہے تو قومی زندگی اور حیات کی نمو میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی منصفانہ تقسیم اور گردش رکنے پر ایسا معاشی عذاب مسلط ہوتا ہے کہ خود ان مالداروں کا سکون بھی غارت ہو جاتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (التوبہ:۳۴)

اے ایمان والو! بیشک بہت سے پادری اور روحانی درویش باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سناؤ۔

(۲۷) تزکیہ سے محروم افراد کا اخلاقی معیار انتہائی پسماندہ ہوتا ہے، ان کی دل لگی و خوش طبعی کا مدار تک تمسخر پر ہوتا ہے، وہ رنگ و نسل اور پیشوں کی بنیاد پر لطیفے بناتے ہیں، ڈرامے اور خاکے لکھتے ہیں، نام، کام اور روایات تک بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ محظوظ ہو سکیں حتیٰ کہ تمسخر کو آرٹ اور فن کے طور پر پیش کرتے ہیں، اسے پیشہ بنا کر اس پر پیسے کماتے ہیں اور مسخروں کو قومی اعزازات دیتے ہیں۔ یہ مزاج وطنی، لسانی اور قومی امتیاز پیدا کر دیتا ہے اور ایسے معاشرے کسی اکائی میں مربوط نہیں پاتے، بلکہ یہی احساس برتری کی کیفیت اور دوسروں پر بے جا بالاتری کا اظہار ان کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے اور انہیں دوسروں سے استفادہ کے قابل بھی نہیں چھوڑتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ

(الحجرات:۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کوئی قوم کسی قوم سے مذاق نہ کرے، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ کوئی عورتیں دوسری عورتوں سے، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ اپنے لوگوں پر عیب لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں کے ساتھ پکارو، ایمان کے بعد فاسق ہونا برا نام ہے اور جس نے توبہ نہ کی سو وہی اصل ظالم ہیں۔

(۲۸) تزکیہ سے محروم معاشروں میں دوسروں کے بارے میں "تحقیق" کا رجحان نہیں ہوتا، اگر دوسرا مخالف ہے تو اس کی عزت کو تار تار کرنے کے لیے آخری حد تک جانا اپنا حق سمجھا جاتا ہے، بھلے اس کے لیے کتنی ہی کمزور اور رکیک بنیاد ہاتھ کیوں نہ لگ جائے اور کتنے ہی غیر معتمد ذریعے سے ہی خبر کیوں نہ پہنچے، بلکہ بعض اوقات تو راوی کا علم تک نہیں ہوتا، بس اڑتی ہوئی خبر کی بنیاد پر دوسروں کے بارے میں پورا بیانیہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ ایسے معاشروں میں عموماً اپنے بیانیوں کی بنیاد ظن و تخمین پر رکھی جاتی ہے اور ظنی مقدمات سے یقینی نتائج کشید کیے جاتے ہیں۔ عقل و منطق کے رو سے انتہائی ناروا ہونے کے باوجود اسے سرعام پیش کرنے میں کوئی عار و باک محسوس نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس ٹوہ و تجسس میں لگنا فن اور خوبی شمار ہوتا ہے کہ کس طرح کسی کا عیب ہاتھ لگ جائے تاکہ موقع پر اسے بلیک میل کیا جا سکے۔ یہ اخلاقی زوال کی انتہائی حدوں کو چھونے والے معاشروں کا حال ہوتا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۖ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ۖ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۔(الحجرات:۱۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو، کیوں کہ بعض گمان تو گناہ ہیں اور ٹٹول بھی نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی سے غیبت کیا کرے، کیا تم میں سے کوئی

پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے سو اس کو تو تم ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم والا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ۔ (الحجرات:٦)

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی سی خبر لائے تو اس کی تحقیق کیا کرو کہیں کسی قوم پر بے خبری سے نہ جا پڑو پھر اپنے کیے پر پشیمان ہونے لگو۔

وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (المائدہ:۵)

ترجمہ: اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر نہ اُبھارے کہ تم انصاف نہ کرو (بلکہ) انصاف کرو، یہ پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تمہارے تمام اعمال سے خبر دار ہے۔

قرآن مجید تزکیہ فراموش قوموں اور معاشروں کے ادبار وزوال کی جملہ خصائل وعادات اور طور طریقوں کو بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے، یہ مختصر سا نقشہ مشتے نمونہ از خروار کے طور پر محض اس لیے پیش خدمت ہے کہ میں اپنے باطن کو ٹٹول سکوں اور انہیں ان خرابیوں پر آگاہ اور مطلع کر سکوں جن میں ابتلا کو قرآن مجید نے ناکامی اور خسارے کا باعث بتلایا ہے اور جنہیں دور کیے بغیر ترقی وکامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

عالم اسلام میں نفاقی سیاست کے اہداف
قرآن مجید کی روشنی میں

اسلام دشمن عناصر نے آغاز اسلام سے ہی اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ مسلمان جماعت کی وحدت کو توڑنے کے لیے ان میں منافقین کی ایک ایسی جماعت کھڑی کر دی جائے تو کفریہ ایجنڈا پر عالم اسلام میں کام کرے اور ان کے ذریعے کفر اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو، تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ کفر کبھی بھی براہ راست عالم اسلام پر غالب نہیں آیا جب تک اندرونی منافقین نے اس کے لیے راستہ ہموار نہ کیا ہو۔ عالم کفر عالم اسلام میں منافقین کے ذریعے نفاقی سیاست کی بنیاد ڈال کر کن اہداف کے لیے کام کرتا ہے؟ اسے عہد نبوت کے ایک بڑے اہم واقعہ کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مدینہ میں یہودی آباد تھے اور یہودیوں کی روز اول سے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ آویزش رہی۔ حضور ﷺ نے ان کی کمر کسنے اور ان کو باندھنے کے لیے میثاق مدینہ کے نام سے معاہدہ کیا تاکہ ان کی سرگرمیوں کو محدود کیا جاسکے۔ لیکن انہوں نے ہر موقع پر مسلمانوں کے ساتھ غداری کی، آپ ﷺ نے ان کے خلاف کئی ایک غزوات لڑے، ان کے کئی سرکردہ افراد کی گوریلا جنگی کارروائیوں میں گردنیں کاٹیں لیکن یہ باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ جب یہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو مغلوب کرنے سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے مسلمانوں کے غلبہ کے اہم راز "وحدت کلمہ" اور "وحدت فکر" کو توڑنے کے لیے ایک سیاسی چال چلنے کی کوشش کی۔ اس کا مختصر پس منظر سمجھنے سے پہلے تمہیداً اگر ہم غور کریں تو قرآن پاک نے بالکل ابتدا میں بڑے تفصیل سے کفار کا، منافقین کا جن میں اکثریت یہود کی تھی اور پھر اہل کتاب کا ذکر کیا ہے اور اہل کتاب کی چالوں سے بڑی تفصیل سے پردہ

اٹھایا ہے، قرآن مجید کے اسلوب سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن اہل کتاب کے حوالے سے مسلمانوں کی ایک ایسی ذہنی، فکری، نظریاتی تربیت کرنا چاہتا ہے کہ گویا یہ اشارہ دے رہا ہے کہ ان کے ساتھ مقابلہ اور آویزش بڑے طویل عرصہ تک جاری رہنی ہے۔ اسی واسطے قرآن پاک نے یہودیوں کے جرائم، ان کی بیماریاں، ان کی نفسیات پوری تفصیل کے ساتھ ایک ایک کر کے بیان کیے۔ اس میں واضح اشارہ ہے کہ ہمیں اس قوم کے حوالے سے کبھی بھی غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیشہ بیدار رہنا چاہیے۔ انہوں نے ویسے تو مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے کئی سیاسی چالیں چلیں تاہم منافقین کے ذریعے اپنے اہداف حاصل کرنے کے ایک طویل منصوبہ بندی کی، جس سے قرآن مجید نے پردہ اٹھا انہیں بری طرح ناکام کیا۔ ہوا یوں کہ مدینہ کے میں ابوعامر نامی ایک آدمی تھا، جو عیسائی راہب ہو گیا تھا، یہ غسیل الملائکہ حضرت حنظلہؓ کا باپ تھا، جب حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے تو یہ عداوت میں جا کر مکہ بیٹھ گیا اور ہر جنگ میں حضور ﷺ کے خلاف شریک رہا، یہودیوں کا ایک مہرہ تھا اور یہودیوں اور مشرکین کے درمیان پل کا کردار ادا کرتا تھا۔ جس وقت مکہ فتح ہو گیا اور اس کے پاس کوئی سیاسی پناہ نہیں رہی تو یہ روم یعنی بازنطینی سلطنت چلا گیا اور وہاں سیاسی پناہ حاصل کر لی، پھر اس نے یہودیوں سے بڑی طویل مشاورت کی کہ مسلمان جماعت کو کیسے توڑا جائے؟ اس طرح مسلمانوں کے خلاف ایک تکون بن گیا۔ ایک بازنطینی عیسائی، دوسرا ابو عامر، تیسرا یہود۔ اس تکون نے مسلمانوں کی کامیابی کا راز معلوم کرنا چاہا کہ یہ کیوں مسلسل کیسے پھیلتے چلے جا رہے ہیں؟ مدینہ کی ریاست ان کے ہاتھ میں آ گئی، مکہ بھی ان کے ہاتھ میں آ گیا، عرب قبائل بھی ان کے تابع ہو گئے، آخر ان کے پاس ہے کیا؟ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انہوں نے جو نظم سیاسی قائم کیا ہوا ہے اس نظم سیاسی کی اساس وحدت کلمہ اور وحدت فکر پر ہے۔ ان کی شورائیت مضبوط ہے، شوریٰ کے اندر یہ بحث و مباحثہ بھی کرتے ہیں، تنقید بھی کرتے ہیں لیکن شوریٰ میں جو بات طے ہو جائے، اس آخری بات پر ان سب کا ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ جب مجلس شوریٰ ختم ہوتی ہے تو ہر شخص یہ بھول جاتا ہے کہ میری رائے بھی کوئی مخالف رائے تھی۔ لہذا ان کی سلطنت کے سیاسی،

عسکری، معاشی امور کے بارے میں نہ تو ان کی گفتگو چوپالوں میں ہوتی ہے، نہ چوراہوں پہ اور نہ سڑکوں پر۔ان کی نظم سیاست میں اپوزیشن (opposition) کا کوئی تصور نہیں ہے،اس میں اختلاف رائے صرف شوریٰ تک ہے، شوریٰ سے باہر اختلاف رائے کا تصور ہی نہیں ہے، سب ایک ہوتے ہیں بس جو امیر کا فیصلہ ہوتا ہے سب اس کے تابع ہوتے ہیں ۔لہٰذا ان کے لیے ایک اپوزیشن(opposition) کھڑی کرنی چاہیے،ایک ایسی سیاسی عصبیت جو ان کے متفقہ فیصلوں پر تنقید برائے تنقید کا ماحول پیدا کر سکے۔

ابو عامر نے یہ پورا منصوبہ بنایا، لیکن مدینہ میں یہ منصوبہ قابل عمل بنانا ناممکن تھا، اس لیے اس کے واسطے مدینہ سے باہر جگہ چنی گئی،لہذا قبا کے قریب ایک مقام منتخب کیا گیا۔ پھر کام کا عنوان کیا رکھنا ہے؟ چونکہ اب مسلمانوں کا نظم حکومت قائم ہو چکا ہے اور مسلمان سیاسی اعتبار سے مضبوطی سے پاؤں جما چکے ہیں، لہذا کام کا عنوان ایسا ہو جو اس معاشرے میں قابل قبول ہو۔لہذا انہوں نے مشورہ کیا کہ عنوان رفاہی اور تعلیمی رکھنا چاہیے۔ تعلیم وتربیت اور رفاہی خدمت کے عنوان سے ہم کام کریں گے۔ اس کے لیے انہوں نے مسجد قائم کی جسے قرآن نے مسجد ضرار کا نام دیا ۔مسجد ضرار کا ایجنڈا یہ تھا کہ جو لوگ کمزور اور ضعیف ہوں گے اور خواتین قبا نہیں جا سکیں گی ان کی تعلیم وتربیت اور عبادت کا یہ ایک مرکز ہو گا۔ غور کریں! کہ نفاقی سیاست کے ذریعے عالم کفر اسلامی حکومتوں میں کس طرح جڑیں گاڑتا ہے اور کن عنوانات سے ان میں داخل ہوتا ہے۔ پھر فیصلہ ہوا کہ اس مرکز کو قانونی حیثیت دینے کے لیے حضور ﷺ سے اس کا افتتاح کروائیں گے ، پھر اہل قبا کی جماعت کو توڑیں گے اور ان کے لوگوں کو ترغیب دیں گے کہ یہاں آپ کے لیے آسانی ہے، یہ آپ کے گھر کے قریب ہے، وہی باتیں یہاں بھی ہو رہی ہیں جو قبا میں ہوتی ہیں، یہاں تعلیم وتربیت میں زیادہ آسانی ہے، خواتین آئیں گی، ایک خاتون کو بگاڑ دیا جائے تو پورا خاندان بگڑ جاتا ہے، اس لیے ہر عہد میں مسلمان خواتین کو مردوں سے زیادہ شکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ ترتیب بنا کر حضور ﷺ سے ملاقات کی۔ تبوک کا معرکہ درپیش تھا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ تبوک سے واپسی

پر میں افتتاح کرنے ضرور آؤں گا۔ جب ان کو یہ منظوری(approval) مل گئی تو انہوں نے خوشی کے شادیانے بجانا شروع کیے کہ ہمارا کام تو ہو گیا۔ ابو عامر نے منافقین کو جو ایجنڈا(agenda) دیا تھا ، قرآن پاک نے ان کی پوری سیاست کا پول کھولا اور تبوک سے واپسی پر حضور ﷺ پہ وحی اتری:

وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مَسۡجِدًا ضِرَارًا وَّ کُفۡرًا وَّ تَفۡرِیۡقًۢا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ اِرۡصَادًا لِّمَنۡ حَارَبَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَ لَیَحۡلِفُنَّ اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّا الۡحُسۡنٰی ؕ وَ اللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ (التوبۃ:۱۰۷)

قرآن نے اس آیت میں عالمکفر کی ایما پر عالم اسلام میں نفاقی سیاست کے چار مقاصد بتائے ہیں کہ کافر جس وقت عالم اسلام میں کام کرے گا، ان چار سیاسی بنیادوں پر کام کرے گا اور یہ چاروں سیاسی مقاصد وہ اپنے مہروں کے ذریعے حاصل کرے گا۔

نمبر ایک :وہ ایک جماعت کھڑی کرے گا، آپ میں سے کھڑی کرے گا، انتہائی اچھے عنوان پہ کھڑی کرے گا، مسجد کا عنوان ہو گا، جہاد کا عنوان ہو گا، تعلیم کا عنوان ہو گا، تربیت کا عنوان ہو گا، آپ کے معاشرتی ضروریات کا عنوان ہو گا، آپ کی معاشی خوشحالی کا عنوان ہو گا، آپ کی سماجی ضروریات کا عنوان ہو گا، اس عنوان سے ایک جماعت اور سیاسی عصبیت قائم کر کے وہ کیا کرے گا؟

پہلا کام " ضِراراً "کہ جس خوشنما عنوان، جماعت اور ادارے کو لے کر وہ میدان میں اترا ہے اس کا مقصد مخلص مسلمانوں اور ان کے اداروں اور جماعتوں کو نقصان پہنچانا ہے، ان کی بنائی ہوئی مسجد کے پاس مخلص مسلمانوں کا قبا کے نام سے مرکز ہے یہ اس کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، اس کے پیکج کا عنوان بڑا خوبصورت ہے لیکن کافر کبھی آپ کو ایسا پیکج نہیں دے سکتا جس میں محض آپ کا ہی فائدہ ہو، وہ آپ کو معمولی فائدہ دے کر آپ کا بڑا نقصان کر جائے گا اور اس سے اپنے بڑے اہداف حاصل کرے گا۔ ایسی ترتیبات شروع کرے گا کہ مسلمانوں کی کمر توڑ دے، جو صحیح مخلصانہ کام ہو رہے ہیں اور جو مخلصانہ شخصیات ہیں ان کا راستہ روکے گا۔

دوسرا کام "کفراً" اس مسجد کا قیام ایک کفریہ ایجنڈے کے باعث ہوا ہے، اس کا کوئی نیک مقصد نہیں لہذا یہ کفر کا ایجنڈا لے کر چلیں گے، ان کے پاس اپنا کوئی ایجنڈا نہیں ہو گا، کفر ان سے جس

طرح کا کام چاہے گا وہ اسی طرح کا کام کریں گے۔ ان کی سیاست ہی اپنے وقت کے مقتدر کفریہ طاقتوں کے ایجنڈے کے تحت ہو گی وہ کہیں گے کہ فلاں مسئلہ کے خلاف بیان دے دیں یہ بیان دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ فلاں فکر نوجوانوں میں عام کر دیں وہ عام کر دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ فلاں خبر کا چرچا کر دیں، یہ کر دیں گے، وہ کہیں گے کہ افراتفری پھیلا دیں یہ پھیلائیں گے، وہ کہیں کہ فحاشی کو پروموٹ کریں یہ فحاشی عام کریں گے۔ ان آپ کا اپنا کوئی بیانیہ نہیں ہو گا وہ کفر کا بیانیہ لے کر چلیں گے۔ لہذا معاشرہ بتدریج اسی ایجنڈے کے تحت آجائے گا جو کفر مسلط کرنا چاہے گا۔ قرآن مجید کھولیں، پڑھتے جائیں اور اپنے عہد کے سیاسی بیانیوں اور ایجنڈوں کی تصویر دیکھتے جائیں، سب سمجھ آجائے گا کہ میری اور آپ کی نظم سیاست کن کے ایجنڈوں کے تحت کام کر رہی ہے۔

تیسرا کام "وَتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" وہ مسلمانوں کے باہمی چھوٹے چھوٹے issue کو اختلاف کا باعث بنائیں گے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کر دیں گے اور ان میں ایک حزب مخالف (opposition) کھڑی کر دیں گے اور جب کسی کام میں اختلاف رائے "ایشو" بن جائے اور وہ بات چوکوں اور چوراہوں پر آجائے تو پھر دشمن کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ فرقہ بندی ان کا بنیادی ہدف ہو گا، سیاسی فرقہ بندی، وطنی فرقہ بندی، قومی فرقہ بندی، لسانی فرقہ بندی، مذہبی فرقہ بندی۔ غرض امت سے امت پنا نکال کر ان کو گروہوں، جماعتوں اور طبقوں میں بانٹنا ان کا مقصد ہے۔

اسلام کے نظم سیاست کا یہ مزاج ہی نہیں ہے کہ اس میں اپوزیشن ہو، کیونکہ جدید نظم ریاست میں تو میں نے جماعت (party) کو بچانا ہے اگر حکومت درست کام کرے گی میں اس پہ بھی تنقید کروں گا کیونکہ وہ میری پارٹی بیانیہ کے خلاف ہو گا۔ ادھر حزب مخالف اگر ٹھیک بات بھی کرے گی تو حکومت کی کوشش یہ ہو گی کہ یہ ٹھیک کو بھی رد کر دیا جائے کیونکہ وہ مخالف کا بیانیہ ہے۔ لہذا ان کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق واتحاد قائم نہ رہنے دیا جائے اور ان کو تقسیم کر دیا جائے۔

چوتھا کام "وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ" جب اس گروہ اور مرکز کو سیاسی غلبہ اور حیثیت مل جائے گی تو حربی کفار کے لیے یہ مسجد اڈا اور مورچہ ہو گا۔ ان لوگوں کا مورچہ، ان

لوگوں کا اڈا، جو لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ پہلے سے لڑ رہے ہیں، بازنطینی اور یہودی وہ اللہ اور رسول کے خلاف برسرپیکار ہیں، ان منافقین نے یہ نظم سیاست کھڑا کر کے ان کو اڈے دینے ہیں، یہ ان کو راستے فراہم کریں گے، یہ ان کو logistic support دیں گے، کفر عالم اسلام میں اپنے ایجنڈے پر کھڑے کردہ سیاسی گروہوں سے بری، بحری اور فضائی راستے لے گا، تب وہ حربی کافر آپ تک پہنچے گا، اس کی جرات ہی نہیں کہ براہ راست آپ کی طرف دست درازی کر سکے، وہ اڈے لے کر آئے گا اور اڈا بھی مقدس زمین کو بنائے گا، ہاں! مسجد و اذان والی زمین کو۔ ان کا آخری مقصد یہ ہے۔ قرآن نے ان کی پوری سیاست کا پول کھولا ہے، آپ اپنے عہد میں دیکھ لیں، آج کفر اسی سیاسی ایجنڈے پر عالم اسلام کے اندر کام کر رہا ہے۔ کیا قرآن پاک ہم نہیں پڑھتے؟ ہم نہیں پڑھاتے؟ کیا یہ آیات ہمارے سامنے نہیں ہیں؟ کیا کفر کے اس نظم سیاست سے اللہ نے چودہ سو سال پہلے پردہ نہیں اٹھایا؟ ہم نے کیا پیش بندی کی ہے؟ کیا زندہ باد اور مردہ باد سے ہم سارا کام چلا لیں گے؟ لائحہ عمل کیا ہے ہمارے پاس؟

جب حضور ﷺ پر یہ وحی اتری تو حضور ﷺ نے مدینہ پہنچنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور وہاں سے حضرت معن بن عدی ؓ اور مالک بن دخشمؓ کو بھیجا کہ میں مدینہ میں داخل ہوں تو اس سے پہلے یہ مسجد زمین سے ملی ہوئی ہو۔ وارثان نبی کے پاس اس نظم سیاست کے مقابلہ کی کیا پالیسی ہے؟ کیا کوئی معن بن عدی اور مالک بن دخشم ان میں پیدا ہو گا جو نفاقی سیاست کے ان مراکز کو زمین بوس کر دے؟ میرے اس سوال پر غور کی درخواست ہے۔

یہودیوں نے اس ترتیب پہ کام چھوڑا نہیں، وہ جا کر حضرت عثمان ؓ کے دور میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے پھر مصر کے دور دراز علاقوں کو چنا ہے، مدینہ سے دور مراکز میں اپنے اسی ایجنڈے پر کام کیا ہے۔ عبداللہ بن سبا کی تحریک یہی یہودی تحریک تھی، کیا اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اپوزیشن (opposition) کھڑی نہیں کی؟ ہڑتالیں ہوئیں کہ نہیں ہوئیں؟ حضرت عثمان ؓ کے دور میں اس تحریک نے جو نتائج حاصل کیے ان کی خونچکاں تاریخ امت کے

سامنے ہے۔ عالم کفر اس پورے عرصے میں ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھا۔ یہ پٹتا رہا لیکن اس کے باوجود سازشوں سے بعض باز نہیں آیا۔ آج پورے عالم اسلام میں کفریہ طاقتوں نے ان چار ایجنڈوں کی تکمیل کے لیے ہر شعبہ زندگی میں لوگ بٹھا رکھے ہیں، وہ مخلص مسلمانوں کو نقصان بھی پہنچا رہے ہیں، ان کے اداروں کو کمزور کر رہے ہیں، ان کے معاشی وسائل لوٹ رہے ہیں۔ وہ کفر کے ایجنڈے، فلسفہ فکر اور بیانیے کو بڑے زور وشور سے پروموٹ کرنے میں مصروف ہے، اس کے لیے ان کے پاس قارون کے خزانے اور میڈیا کا ہتھیار ہے، منظم تعلیمی ادارے ہیں جہاں سے وہ رنگ ونسل کے مسلمان اور عقیدہ و نظریہ کے انگریز میں اتار رہا ہے۔ اسے نے مسلمانوں میں تفریق بھی پیدا کر دی، مسلمان رنگوں، نسلوں، زبانوں، قوموں اور وطنوں میں بٹا ہوا ہے اور ان کے پاس کوئی عملی اکائی موجود نہیں۔ جبکہ اس نے اپنا آخری مقصد بھی بخوبی حاصل کر لیا ہے، اس نے جو سیاسی عصبیتیں خالص نفاقی بنیادوں پر کھڑی کیں، ان کے مراکز ان کے اڈے ہیں، ان کے مورچے ہیں جہاں سے وہ اپنا فکر عام کر رہا ہے، اپنا فلسفہ حیات مسلط کر رہا ہے اور جہاں سے بری، بحری اور فضائی راستوں کو استعمال کر کے عالم اسلام میں جہاں چاہتا ہے حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اس نفاقی سیاست کا مقابلہ نبوی سیاست کے ان قرآنی اقدار سے مزین وآراستہ ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ کاش! امت میں دینی سیاست کے عنوان سے سرگرم عمل سیادت وقیادت اس نکتہ کو سمجھ لے۔ وہ اپنی محنت پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ ہوں، ان کا بہترین سرمایہ، وقت، جوانی اور قوت صرف ہو رہی ہے، قربانیاں لگ رہی ہیں، لیکن اپنی ہی زمین پر سیرابی کے باوجود فصل نہیں مل رہی۔ اگر ہم آج نبوی سیاست کی طرف عود کرنے کا عزم کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم عالم اسلام میں برپا ان بحرانوں پر قابو پا لیں، جن سے عرصہ تین سو سال سے یہ امت نبرد آزما ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ